سہ ماہی

اردو ادب

انجمن ترقی اردو ہند

اردو ادب (سہ ماہی)

۱۹۹۳ء شمارہ (۲) تا (۴)

اردو ادب

(راج بہادر گوڑ نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

فہرست

حرفِ آغاز	خلیق انجم	۷
بات ہیں سادہ و آزادہ معانی ہیں دقیق	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۱۲
راج بہادر گوڑ ایک منفرد شخصیت	سید حامد	۱۸
تاثرات	پروفیسر آل احمد سرور	۲۳
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پیکرِ جہدِ مسلسل	کمال الدین احمد	۲۵
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ	اتولک رام	۲۹
ادبی تناظر پر ایک نظر	ڈاکٹر عبد المغنی	۳۱
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ	مجتبیٰ حسین	۳۷
ڈاکٹر گوڑ کی تنقیدی نگارشات	پروفیسر قمر رئیس	۴۶
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ادبی تناظر کے آئینے میں	رفعت سروش	۵۴
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مجاہد آزادی ---- محب اردو	جواد رضوی	۶۶
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اردو کی ایک فعال شخصیت	ایم حبیب خاں	۷۵
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ	منوہر راج سکسینہ	۸۲
ہمارے گوڑ صاحب	شمیم جہاں	۹۳
خواتین ادب اور راج بہادر گوڑ	ڈاکٹر صادقہ ذکی	۹۹
ڈاکٹر راج بہادر ـــ ایک شخصیت منور مثلث	قمر جمالی	۱۰۸
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی تحریریں	ـــ	۱۲۲
خطبۂ صدارت بہار ریاستی اردو کانفرنس مظفر پور	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	۱۲۳
خطوط گوڑ	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	۱۳۴

۱۹۹۳ء شمارہ (۲تا۴)

سالانہ قیمت	ــــــــــــ	۷۵ روپے
فی شمارہ	ــــــــــــ	۲۰ روپے
موجودہ شمارہ	ــــــــــــ	۵۰ روپے

170622
13.10.97

پرنٹر پبلشر ایم۔ حبیب خاں، اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے ثمر آفیسٹ پرنٹرس نئی دلّی میں چھپوا کر اردو گھر راؤز ایوینیو نئی دلّی سے شائع کیا۔

حرفِ آغاز

هند ایرانی تہذیب نے دلّی میں جنم لیا اور صدیوں تک اسی سرزمین پر پروان چڑھی۔ جب دلّی اُجڑ گئی تو اودھ، حیدرآباد، رام پور اور دوسری ریاستیں اس تہذیب کی اہم مرکز بن گیئں، جہاں یہ تہذیب اپنے عروج کو پہنچی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حیدآباد کے رہنے والے اور ہند ایرانی تہذیب کے بہترین نمائندے ہیں۔ ان کی ذات ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کا حسین مرقع ہے۔

گوڑ صاحب ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۶ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ اکثر راجیہ سبھا میں اردو کے بارے میں بیان دیتے تھے، جسے اُردو اخبار بہت نمایاں کرکے شائع کرتے تھے۔ ان ہی بیانات کے توسط سے گوڑ صاحب سے میرا غائبانہ تعارف ہوا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں جب انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا تو معلوم ہوا کہ گوڑ صاحب بھی انجمن کے رکن ہیں۔ اُردو کے اِس مجاہد سے میری پہلی ملاقات انجمن کی مجلس عاملہ کے اس جلسے میں ہوئی جو میرے تقرر کے کچھ دن بعد منعقد ہوا تھا۔ ملاقات کے ابتدائی چند لمحوں ہی میں گوڑ صاحب نے مجھے متاثر کرلیا۔ سانولا رنگ، کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں مخصوص چمک اور ذہانت، گھنے کھچڑی بال، سفید کم کالے زیادہ، صحت مند جسم، مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ، بات بات میں مذاق اور دوسروں سے چھیڑ چھاڑ۔ اس وقت گوڑ صاحب سفید شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس واقعے کو بیس سال ہوچکے ہیں۔ اب بھی گوڑ صاحب کی شخصیت ویسی ہی ہے۔ صرف بال زیادہ سفید ہوگئے ہیں اور جسم کچھ دُبلا ہوگیا ہے۔

گوڑ صاحب نے ابتدائی اور اعلا تعلیم حیدر آباد میں حاصل کی۔ اُن کا شمار ہمیشہ بہت اچھے طلبہ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ہر امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ لیکن ڈاکٹری کا پیشہ اختیار نہیں کر سکے۔ کیوں کہ ہوش سنبھالتے ہی وہ مختلف سماجی اور سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ اعلا تعلیم کے ابتدائی دنوں ہی میں وہ آریا سماجی تحریک کے سرگرم کارکن ہوگئے۔ اُس کے کچھ دن بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں کھادی تحریک سے اتنے متاثر ہوئے کہ گھر گھر جاکر کھدر تحریک کا پرچار کرتے اور لوگوں کو کھدر کے فوائد سے آگاہ کرتے۔ خود بھی کھدر پہنتے۔ آج بھی اُن کا پسندیدہ لباس کھدر کے کپڑے ہی ہیں۔ ۱۹۴۰ء ہی کا زمانہ ہے، جب عالم خوند میری، جواد رضوی، مرزا حیدر حسن، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر گوڑ نے کامریڈز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور کچھ ہی دن بعد گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر بن گئے، حیدر آباد میں اس پارٹی پر پابندی عائد کردی گئی، لیکن ڈاکٹر گوڑ اور اُن کے ساتھیوں کی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ جیل میں گوڑ صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی تو انھیں ہسپتال میں داخل کردیا گیا۔ ۷ مئی ۱۹۴۷ء کو گوڑ صاحب ہسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ روپوش تھے۔ لیکن ۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء میں ضلع نالگنڈہ کی دیور کنڈہ پہاڑیوں سے گرفتار کرلیے گئے۔ حکومت نے انھیں نظر بند کردیا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوگئے۔ حکومت کو مجبوراً انھیں رہا کرنا پڑا۔ ۱۹۵۷ء میں اُن کی راجیہ سبھا کی رکنیت کی مدت ختم ہوگئی۔ لیکن دوبارہ منتخب ہوگئے۔ اور ۱۹۶۲ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین کے اہم لیڈر رہیں۔ اگرچہ اب اُن کی عمر پچھتر سال سے زائد ہے۔ لیکن اُن کی سیاسی سرگرمیاں بدستور قائم ہیں، اور اب بھی وہ ٹریڈ یونین کے سلسلے میں پورے ہندوستان میں گھومتے ہیں۔

گوڑ صاحب اُردو تحریک کے ایک اہم رہنما ہیں۔ اُردو سے متعلق دستورِ ہند

کی دفعات سے جتنی واقفیت گوڑ صاحب کو ہے، میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں کسی اور کو نہیں ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ مختلف ریاستوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو کہاں تک عملی روپ دیا ہے۔ مرکزی حکومت نے ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء کو سردار جعفری کمیٹی کی صدارت میں پندرہ سولہ ادیبوں، دانشوروں اور پروفیسروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ جیسا کہ ہوتا ہے کہ کمیٹی میں صرف دو تین لوگ تھے جو مسائل سے واقف تھے۔ ان دو تین لوگوں میں گوڑ صاحب بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ لکھنے اور سفارشات مرتب کرنے میں گوڑ صاحب کا بہت اہم رول رہا ہے۔

گوڑ صاحب گذشتہ چوالیس سال سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے حیاتی رکن ہیں۔ اور دو دفعہ انجمن کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ آج کل انجمن کی مجلسِ عاملہ کے اہم رکن اور جنوبی ہند کی شاخوں کے چیرمین ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) کے بھی نائب صدر ہیں۔ ان دونوں انجمنوں کے ذریعے وہ ہمیشہ اردو کی بقا، ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ گوڑ صاحب سیاست داں ہیں لیکن انھوں نے زبان کے مسائل کو ہمیشہ سیاست سے دور رکھا۔ بس ایک واقعہ سن لیجیے۔ مالک رام مرحوم، انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر تھے۔ جب اُن کی مدتِ صدارت ختم ہوئی تو انجمن کے کچھ اراکین نے گوڑ صاحب کو صدارت کا امیدوار بنانا چاہا۔ لیکن گوڑ صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں سیاسی آدمی ہوں۔ میرے صدر ہونے سے انجمن کو نقصان پہنچے گا۔

گوڑ صاحب کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اُن کی وسیع القلبی، کشادہ دلی اور سیکولر رویّہ ہے۔ اُن کا سیکولرازم مصلحتوں کا پیدا کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ اُن کا عقیدہ ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسان دوست ہیں۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن اُن کا مذہب انسانیت ہے۔ مجھے پچھلے پندرہ برسوں سے اُن سے قربت حاصل ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کمزور سے کمزور لمحے یا مذاق میں بھی کسی مذہبی فرقے کے خلاف ایک لفظ بھی کہا ہو۔

گوڑ صاحب اُردو کے ممتاز ادیب اور نقّاد ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ اُن سیاسی سرگرمیوں میں گزرا ہے، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس کے باوجود ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ تحفے میں ملنے والی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ کتابیں خرید کر پڑھنے کے عادی ہیں۔ جب بھی دہلی آتے ہیں تو اُردو گھر ضرور آتے ہیں۔ اُردو گھر آتے ہیں تو بُک ڈپو جاتے ہیں اور کتابیں ضرور خریدتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انجمن کی بُک ڈپو کے مقروض رہتے ہیں۔ جب بھی اردو گھر آتے ہیں پچھلا حساب چُکاتے ہیں۔ اور قرض پر نئی کتابیں لیتے ہیں۔ حیدرآباد میں اُن کی ذاتی لائبریری میں انگریزی اور اُردو کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ٹریڈ یونین کے لیڈر کی حیثیت سے گوڑ صاحب کو بہت سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر اُن کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ کیوں کہ سفر کے دوران انھیں مطالعے کا شوق پورا کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

گوڑ صاحب کی پہلی تحریر ۱۹۴۳ء میں روزنامہ "پیام" حیدرآباد میں شائع ہوئی تھی، وہ عرصے سے تنقیدی مقالے اور تبصرے لکھ رہے ہیں۔ جو ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تنقیدی مضامین کے تین مجموعے "ادبی مطالعے" "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر" شائع ہو چکے ہیں، گوڑ صاحب کو اپنے مرحوم دوست مخدوم محی الدین سے بہت محبت ہے۔ انھوں نے مخدوم پر انگریزی میں کتاب لکھی ہے۔ ریاست حیدرآباد کی تحریک پر بھی اُن کی دو کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں اُن کے تنقیدی اور سیاسی مضامین اور تبصرے ہیں، جو مختلف ادبی رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے آرگن "کمیونسٹ جائزہ" کے چار سال اڈیٹر رہے ہیں۔ اُن کی تنقیدی کتاب "ادبی تناظر" انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس کا پیش لفظ لکھا تھا۔ اِس پیش لفظ میں گوڑ صاحب کے تنقیدی رویّے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، اُسے ہی دُہرا دیتا ہوں۔ میں نے لکھا تھا۔

نظریاتی اعتبار سے گوڑ صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ وہ ادب اور زندگی کے باہمی روابط اور ادب کی مقصدیت کے قائل ہیں۔ ادب کو زندگی کے معاشی

اور طبقاتی رشتوں کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ادب میں صرف مقصدیت ہی کو نہیں، اُس کی ہیئت، اسلوب کی خوبصورتی اور جمالیاتی حُسن کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ گوڑ صاحب قدیم ادب اور جدید ادب دونوں کا احترام کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں، ہم عصروں اور نوجوانوں کے ادب کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اُس کا رویّہ ایک سخت گیر اور اپنی علمیت کا لوہا منوانے والے نقاد کا نہیں۔ ایک ہمدرد، ہم سفر کا ہوتا ہے۔ وہ غالب کے کلام میں جاگیرداری اقدار کو بنیاد بنا کر غالب کو ہدفِ ملامت بنانے کے بجائے پورے سیاسی سماجی اور تہذیبی پس منظر میں غالب کے کلام کا عالمانہ انداز میں تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنے بزرگ مصنفین میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قائل ہیں اور خاص طور سے اُن کے سیکولر رویے کے زبردست مدّاح ہیں۔

گوڑ صاحب کی تحریروں کو پڑھ کر اُن کی بصیرت، دقّتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور سلامت روی کا اندازہ ہوتا ہے۔

خلیق انجم

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا جب خیال آتا ہے یا ان کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے تو علامہ اقبال کا یہ شعر حافظے میں چمک اٹھتا ہے۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

جنگ آزادی کا یہ سپاہی اور اردو شعر و ادب کا یہ نقاد اسی شعر کی تفسیر ہے۔

آج تو اس مجاہد آزادی اور اردو کے اس باعثِ فخر نقاد اور نثر نگار سے اس خاکسار کا تعلق جان اور دل کا سا ہے لیکن میں بات اس وقت سے شروع کرنا چاہتا ہوں جب راقم التحریر اس جوہر قابل کے نام اور کام سے آشنا نہیں تھا۔

۱۹۴۸ء کی بات ہے حکومت ہند نے یونائٹڈ پبلی کیشنز کا دفتر بند کر کے اس کی جگہ پبلی کیشنز ڈویژن کی بنیاد رکھی اور اردو کے ماہنامہ "آج کل" کو از سرِ نو جاری کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دو اور ماہناموں کا بھی اجرا کیا تھا۔ ایک بین الاقوامی سیاست کے موضوع پر اور ایک بچوں کے لیے۔

جوش ملیح آبادی پبلی کیشنز ڈویژن میں شعبہ اردو کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان کے ساتھ اسسٹنٹ اڈیٹر کے طور پر عرش ملسیانی، بلونت سنگھ اور راقم التحریر کا تقرر ہوا۔ کام کی تقسیم یوں ہوئی کہ "آج کل" کی ادارت عرش کے سپرد ہوئی "بین الاقوامی سیاست والا جریدہ" بساط عالم" راقم التحریر کے حصے میں آیا اور بچوں کے ماہنامہ "نونہال" کا کام بلونت سنگھ کے سپرد ہوا۔

ابھی ان جرائد کو منظر عام پر آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایک دن ہمیں پتا چلا کہ ایک ممبر پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ میں ماہنامہ "آج کل" کا مسئلہ اٹھایا ہے اور اس کی کسی

اسی ایسے مضمون کی نشاندہی کی ہے جس میں جا بجا ساقط المعیار زبان کا استعمال ہوا ہے۔ اب پینتالیس برس بعد یہ مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ وہ کس کا مضمون تھا۔ اور اس کا موضوع کیا تھا۔ دوسرے دن ہمیں معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اٹھانے والے ممبر پارلیمنٹ کا اسم گرامی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہے۔

اس وقت تک میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے نام اور کام سے واقف نہیں تھا بلونت سنگھ بھی اس نام سے آشنا نہیں تھے۔ عرش ملسیانی بھی۔ حیرت ہے کہ جوش صاحب نے بھی اس معاملے میں ہماری کوئی رہنمائی نہ کی کیوں کہ میرا اندازہ ہے کہ جوش چوں کہ اس زمانے میں ادب کی ترقی پسند تحریک کے امیر کارواں سمجھے جاتے تھے اس لیے ممکن ہے وہ راج بہادر گوڑ کے نام اور کام سے آشنا ہوں لیکن اس گتھی کو سلجھانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکے۔

دو ایک روز بعد عرش ملسیانی دور کی کوڑی لائے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ راجستھان کے رہنے والے ایک صاحب ہیں۔ وہ ہیں تو کانگرس کے رکن لیکن اردو کے مخالف ہیں اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماہنامہ "آج کل" کو بند کرا دیا جائے۔

میں نے عرش سے کہا یار ذرا "آج کل" کا وہ شمارہ تو دکھاؤ یا وہ مضمون جس پر اعتراض کیا گیا ہے کیونکہ انجام کار تو منسٹری ہمارے ڈائرکٹر سے پوچھے گی، ڈپٹی ڈائرکٹر سے، ڈپٹی ڈائرکٹر جوش صاحب سے اور جوش صاحب ہم لوگوں سے۔ اس لیے ہمیں کچھ معلوم تو ہو تا کہ ہم جوش صاحب کو مشورہ دے سکیں۔

اب جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں اس وقت تک اس مضمون یا اس کے موضوع سے خالی الذہن ہو چکا ہوں لیکن اتنا یاد ہے کہ مضمون پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس میں واقعی زبان و بیان کی اغلاط موجود ہیں۔ حیرت ہے کہ عرش صاحب کی ادارت میں یہ سب کیسے ہو گیا۔ ہو سکتا ہے وہ مضمون غلطی سے کاتب کے پاس چلا گیا ہو لیکن اس کے پروف تو عرش صاحب کو پڑھنا تھے۔ اور عرش ایسے محتاط اور ذمہ دار شخص سے یہ بعید تھا کہ وہ اتنی بڑی کوتاہی کے مرتکب ہوئے ——— اس صورت حال کے پیش نظر ہم لوگوں کی پریشانی اور بڑھی لیکن اس بات سے اطمینان ہوا کہ اردو کے جریدے میں زبان و بیان کی اغلاط پر اعتراض کرنے والا کوئی بھی شخص خواہ وہ ممبر پارلیمنٹ ہو یا نہ ہو اردو کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ وہ اردو کا حامی اور اردو کا دوست ہی ہو سکتا ہے اس لیے یہ اندیشہ بے بنیاد ہے کہ معترض ماہنامہ "آج کل" کو بند کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

بہر طور ہم لوگوں نے کسی قدر پریشانی کے عالم میں جوش صاحب سے جب ساری صورت حال کا ذکر کیا تو انھوں نے اس بات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ ہم نے کہا کہ جوش صاحب معاملہ بہت سنجیدہ ہے، پارلیمنٹ میں آچکا ہے تو وہ کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں میں پنڈت جی سے کہہ دوں گا۔ میں نے عرض کیا جناب پنڈت جی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سردار پٹیل کی منسٹری ہے اور سردار پٹیل تک بات پہنچے گی ہی نہیں اور ہم لوگوں پر کوئی نہ کوئی عذاب ٹوٹ پڑے گا جوش صاحب پر ہماری اس فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کہنے لگے تو ہم سردار پٹیل سے کہہ دیں گے۔

اب اس مضمون میں یہ بتانے کی تو گنجائش نہیں ہے کہ سردار پٹیل بھی پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح جوش صاحب پر کس قدر مہربان تھے اور کس طرح ان کی ناز برداری کیا کرتے تھے لیکن اتنا یاد ہے کہ جوش صاحب کی جب دو ایک روز میں سردار پٹیل سے ملاقات ہوئی تو معلوم نہیں انھوں نے سردار پٹیل سے کیا کہا کہ وہ اعتراض ایک چھوٹے سے نوٹ کی صورت میں یا شاید ٹیلی فون کی صورت میں ہمارے ڈائرکٹر تک پہنچا اور وہاں سے جوش صاحب تک کہ اپنے اسٹاف سے کہہ دیجیے کہ "آج کل" بساط عالم اور "نونہال" کے کام میں محتاط رہا کریں۔ گویا ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

اس زمانے میں میرا قیام اپنے والدین اور بچوں کے ساتھ پُل بنگش کے محلے میں تھا۔ ساحر لدھیانوی بھی لاہور چھوڑنے کے بعد اسی پُل بنگش نامی محلے میں آکر آباد ہوئے تھے یہ کاشش پنڈت کے پڑوس میں۔ ایک دن میں نے ان سے بر سبیل تذکرہ پوچھا کہ یار یہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ممبر پارلیمنٹ کون صاحب ہیں تو ساحر لدھیانوی نے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہی نہیں ہیں عوام کے رہنما بھی ہیں، اردو کے عاشق ہیں اور ٹریڈ یونینوں میں بہت کام کر رہے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عرش نے ہمیں کیا بتایا تھا اور حقیقتاً معاملہ کیا ہے۔ گویا عرش صاحب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کرکے لائے تھے وہ سرتاپا غلط تھیں۔ نہ یہ راجستھان کے رہنے والے تھے، نہ کانگرس کے ممبر، نہ اردو کے مخالف اور نہ "آج کل" کو بند کرانے کی کوشش کرنے والے۔

اگلے دن جب میں دفتر گیا اور جوش صاحب کے کمرے میں ہم سب لوگ جمع ہوئے تو میں نے

ساحر لدھیانوی سے اپنی بات چیت کا ذکر کیا اور بتایا کہ بقول ساحر لدھیانوی راج بہادر گوڑ اردو کے عاشق ہیں۔ کمیونسٹ رہنما ہیں! اور پھر میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ جوش صاحب آپ کی تو ان سے واقفیت ہوگی۔ کہنے لگے ہاں، ملاقات ہو چکی ہے۔ لیکن نہ جانے کیسے حافظے سے یہ بات اتر گئی۔

بہر طور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے راقم کا یہ پہلا تعارف تھا۔ یک طرفہ تعارف یعنی میں ان کے اسم گرامی سے اور کسی حد تک کام سے آشنا ہوا۔ اب اخبارات میں جب کبھی ان کا نام دیکھتا تو ساری خبر میں اول سے آخر تک پڑھتا۔ گویا ان کا سیاسی کام کسی حد تک سامنے آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور ملاقات کی بات یہ ہے کہ میں پبلی کیشنز ڈویژن یعنی گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا اور راج بہادر گوڑ ہوں یا سردار جعفری، مجروح ہوں یا کیفی یا مخدوم ہوں، ان کا کام تھا گرفتار ہونا جیل جانا۔ رہا ہو کے آنا پھر گرفتار ہو جانا۔ ادھر صورت یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی تو دور کی بات ہے۔ PWA اور IPTA تک سے قربت ہم لوگوں کے لیے ممنوع تھی۔

اس کے کافی مدت بعد جب میں ۱۹۷۶ء میں ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت سے سبکدوش ہوا اور انجمن ترقی اردو کے ایک رکن کے طور پر منتخب ہوا تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے ملاقاتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو اس وقت تک جاری ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی رکنیت کے دوران میں یہ بات بڑی وضاحت سے میرے سامنے آئی کہ گوڑ صاحب کے دل میں اردو کے لیے محبت اور درد کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ بات میرے لیے ایک طرح سے قابلِ رشک تھی اور ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندوستان میں گوڑ صاحب اپنے دردمندانِ اردو موجود ہیں ہم اردو والوں کی جدوجہد میں کوئی کمزوری نہیں آسکتی اور انشاء اللہ ایک روز اس جدوجہد کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔

ڈاکٹر گوڑ کی زندگی قید و بند کی صعوبتوں میں کٹی ہے۔ لیکن اردو اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے اقلیتوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے جو آواز بلند کی ہے، اور عملی طور پر جو کام کیا ہے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ہماری سیاسی اور سماجی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر گوڑ کے ساتھ مجوزہ اردو یونی ورسٹی کمیٹی میں بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور اگرچہ یہ یونیورسٹی کسی مذہبی اکثریت یا اقلیت کے مفادات کے پیشِ نظر قائم نہیں کی جا رہی ہے لیکن گوڑ صاحب نے جب بھی اس یونیورسٹی کی افادیت کے پیشِ نظر تجاویز پیش کی ہیں ان میں ملک کی اقلیتوں کے مفاد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ اردو یونیورسٹی کمیٹی نے بھی ان تجاویز کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور انھیں اپنی رپورٹ میں جگہ دی ہے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر گوڑ کی زندگی کا ادبی پہلو بھی ہمارے سامنے آیا اور یکے بعد دیگرے ان کی تین کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ "ادبی مطالعے"، "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر"۔ اور ایک کتاب انگریزی میں مخدوم محی الدین کی شاعری پر۔ یوں تو ان کی دو کتابیں ریاست حیدرآباد کی تحریک سے متعلق بھی ان کے قلم سے نکلیں لیکن اول الذکر چاروں کتابیں ڈاکٹر گوڑ کی علمی، ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

جہاں تک ادبی تخلیقات کا تعلق ہے ڈاکٹر گوڑ نے ہمیشہ اس نظریے کی حمایت کی ہے کہ ادبی تخلیق میں یا کسی فن پارے میں کیا کہا گیا ہے، اور کیوں کہا گیا ہے۔ برابر کی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس موضوع پر خوب صورتی کے ساتھ بحث کرتے ہوئے آپ اپنے مضمون "روشنائی، ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی" میں لکھتے ہیں۔

> پروپیگنڈہ بھی زندگی کا لازمی عنصر ہے اور پروپیگنڈے کا روپ بھی معیاری ادب ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ادب کے سماجی مقاصد کے ساتھ اس کے جمالیاتی پہلو سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ چناں چہ یہی تبلیغی عنصر کرشن چندر کے افسانوں کی جان ہے۔ ان کے شاہکار افسانے وہی ہیں جن میں انھوں نے اپنی سماجی بصیرت کو اپنے مقصد کے موزوں فنی ہیئت میں پیش کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو حالی سے اقبال تک اور نذیر احمد سے پریم چند تک نظم و نثر کی بے شمار تخلیقات میں پروپیگنڈا نظر آئے گا ـــــ پروپیگنڈہ جسے فنی ہیئت حاصل ہو گئی ہے۔"

"روشنائی، ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی"۔ آپ کی تصنیف "ادبی تناظر" کا پہلا مضمون ہے اس تصنیف کے تمام مقالات مثلاً "غالب اور ذہن جدید" سماجی تقاضے اور ادیب کے فرائض،

آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت، مولانا محمد علی، خواجہ احمد عباس، مخدوم ایک پہلو دار شخصیت راجندر سنگھ بیدی۔ ایک عظیم فن کار اور جلیل مانک پوری ـــــ عہد اور کلام جادۂ نقد و نظر پر روشن چراغوں کی مانند چمک دمک رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر گوڑ کے ترقی پسند خیالات سے شعر و ادب کی محفل میں چاروں طرف روشنی برسا رہے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی سنجیدہ تحریروں میں جہاں کہیں طنز و مزاح کی لہر آجاتی ہے۔ وہ ان تحریروں کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ راقم التحریر کی کتاب "محمد اقبال ـــــ ایک ادبی سوانح حیات" جب شائع ہوئی تو اس سے دو چار ماہ قبل میری چند ادنیٰ تصانیف بھی جو ایک مدت سے پریس میں تھیں یکے بعد دیگرے چھپ کر منظر عام پر آگئیں۔ تو "محمد اقبال ـــــ ایک ادبی سوانح حیات" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنی تحریر دل پذیر کچھ اس طرح شروع کی کہ "جگن ناتھ آزاد کتابیں تصنیف کرنے کے معاملے میں فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہیں ـــــ" اور اس طرح اپنی نقادانہ تحریر کو آخر تک دلچسپ اور دلکش بناتے چلے گئے۔

آج ہم یہاں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پچھترویں سال گرہ جسے ڈائمنڈ جوبلی کہا جاتا ہے۔ مبارکباد دینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے یہ پچھتر برس انتہائی مصروف انداز سے اور بھرپور طریقے سے بسر کیے ہیں۔ مصروف زندگی کے بارے میں مجھے اس وقت اپنا ایک پرانا شعر یاد آرہا ہے۔

اے تو کہ تجھ کو ناز عبادت پہ ہے بہت
مصروف زندگی بھی عبادت سے کم نہیں

میں اس مصروف زندگی بسر کرنے پر اپنے محترم دوست، اپنے برادر معظم ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو دلی مبارکباد دیتے ہوئے اپنے اس ہدیۂ محبت و عقیدت کو غالب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سید حامد

راج بہادر گوڑ ایک منفرد شخصیت

راج بہادر گوڑ کی شخصیت تہ دار بھی ہے، پہلودار بھی۔ ورنہ ادب کو سیاست سے بیر رہا ہے پھر بھی راج بہادر گوڑ چابک دستی کے انداز سے دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔ پہلی نظر میں ان پر منسوڑ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ذہن کے نہاں خانہ میں جھانکیے تو وہ مقطع نظر آئیں گے۔ تاہم تھوڑی دیر بھی ان کے ساتھ بیٹھیے تو خندہ زیر لب سے آگے بڑھنا پڑے گا۔ نام ان کا رکھا گیا راج بہادر لیکن انھوں نے عمر عزیز راج کو بزدل ثابت کرنے، اس کے خلاف بغاوت کرنے اور اسے پسپا کرنے میں صرف کی۔ اور جس گھڑی بدیسی راج کے پاؤں اکھڑے اور دیسی راج بنام جمہوریت کے پاؤں جمے، اس گھڑی انھوں نے تجدید بغاوت کا پیماں باندھ لیا۔ حالات زیادہ سازگار اور خطرات بے شمار ہو گئے اور ہتھ کڑیاں ہوا میں لہراتی ہوئی نظر آئیں تو زیر زمیں چلے گئے، قارون کے اس خزانے کی تلاش میں جو وہ راستے میں لٹاتا چلا گیا تھا۔ دریا دلی کے تحت نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اب وہ خود اس کو صرف کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ لیکن ہم یہاں قارون کی پسپائی کے محرکات پر غور کرنے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہمیں تو راج بہادر کی شاہانہ پیش قدمی کو خراج ادا کرنا ہے۔

ہندوستان کو جہد بسیار کے بعد آزادی تو مل گئی، لیکن اسے بھرپور بنانا، اسے منصفانہ رخ دینا، اس کے تحت ذرایع واثمار پیداوار کو عادلانہ ڈھنگ سے تقسیم کرنا، یہ سب کچھ باقی تھا اور اس میں سے بہت کچھ اب بھی باقی ہے۔ راج بہادر ان بے تاب ارواح میں سے ہیں جو سفر سے جی لگاتی ہیں اور منزل سے نہیں گھبراتی ہیں۔ انھیں ایک لمحہ بھی اس میں شک نہیں ہوا کہ آزادی مقصد نہیں ذریعہ ہے، ذریعہ سماجی اور معاشی ناانصافیوں سماجی نابرابریوں کو دور کرنے کا۔ چناں چہ انھوں نے ٹھان لی کہ سرمایہ کے ہاتھوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان پر روک لگائیں گے۔ جدید صنعت نے دست دولت آفریں کو جس طرح کچلا اور کچل رہی ہے، راج بہادر نے اس کے

خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اب اس ضمن میں کیا کر رہے ہیں، کیا اضمحلال کی گرفت میں تو ار کے ساتھ ساتھ جذبہ بھی آگیا۔ عقیدت کہتی ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ لوگ جو مظلوموں کی دست گیری کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں، وقت کا احترام ابن الوقت بن کر کبھی نہیں کرتے۔ اس سے بہتر ان لوگوں کی ترجمانی نہیں ہوسکتی جیسی لسان الغیب کر گئے ہیں۔

ازاں بہ دیر مغانم عـــزیز می دارند

کہ آتشی کہ نمیـــرد ہمیشہ در دل ماست

میں باوجود پرانی لکیروں پر چلنے کے عقیدت مندانہ کنکھیوں سے ان سرفروشوں کو دیکھتا رہا ہوں ایک طرف ان معدود سے چند سرفروشوں کو۔ کبھی دوسری طرف ان ایمان فروشوں کو جو ماضی قریب میں انبوہ در انبوہ ایوان سیاست میں در آئے ہیں۔ تب جاکر بغاوت رہ کا اندازہ ہوگا۔

راج بہادر گوڑ کے سوانح حیات کی سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ علاج معالجے سے ان کا جو تعلق رہا ہے۔ اس کی روداد پر آکر رک گیا۔ حکایت لذیذ تھی، نظریں اسے دیر تک دہراتی رہیں۔ گوڑ صاحب نے ایم بی بی ایس کیا یعنی مجاہدے کے بعد ڈاکٹر بنے۔ معلوم نہیں ڈاکٹری سے طبیعت کیوں اچاٹ ہوگئی۔ ان کے سوانح نگار نے شاید مصلحتاً یہ صراحت نہیں کی کہ مطب ان کی آماج گاہ سرے سے بنا بھی کہ نہیں، شاید انھیں یقین نہ تھا کہ اگر وہ اس شریفانہ پیشہ کو، جس کی تیاری میں انھوں نے پانچ چھ سال کھپائے تھے۔ اختیار کریں گے تو اس کے نتیجے میں ہندوستان کی آبادی برقرار رہے گی یا گھٹ جائے گی۔ ان لوگوں پر جو ایم بی بی ایس یا بی ایس سی (انجینیرنگ) کرکے دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں اعتراض کی انگلی اٹھا کرتی ہے کہ انھوں نے میڈیکل یا انجنیرنگ کالج کی قیمتی نشستیں ضائع کردیں لیکن میں، جو سول سروسیز کے انٹرویو میں ان بے شمار ڈاکٹروں اور انجینیروں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ جو شوقِ لیلائے سول سروس میں مبتلا ہوگئے تھے، راج بہادر گوڑ پر حرف گیری کیسے کروں۔ وہ سول سروس کے دام میں گرفتار ہونے سے رہے۔

بروایں دام برجائے دگرنہ

کہ عنقارا بلند است آشیانہ

انھوں نے تو مظلوموں اور ستم رسیدوں کی دادرسی اور یاوری کو مقصد حیات بنا لیا۔

کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ گوڑ صاحب کے علاج معالجے سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا ہو یا نہ ہو، خود انھوں نے نظام چہارہ گری سے انوکھے طور پر فائدہ اٹھایا۔ خدا نخواستہ دائم المریض ہو کر نہیں بلکہ بیماری کو مادِ نجات بنا کر۔ گوڑ صاحب ٹھہرے فعال اور متحرک آدمی۔ زنداں میں ان کا دل کیوں کر لگتا۔ چناں چہ خود کو علاج کا مستحق بنایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قدرت نے ہی ان کی رہائی بیماری کے راستے لکھی ہو۔ بیماری واقعی تھی یا مصنوعی۔ ہمیں پردے کے پیچھے جھانکنے کی ضرورت نہیں۔ جنگی قیدیوں کی طرح سیاسی قیدیوں کے لیے فرار کی ہر راہ روا ہے۔ راج بہادر گوڑ کی تازہ تصنیف "ادبی مناظر" میں حسن بیان اور لطف زبان کی تلاش بے سود ہوگی۔ فاضل مصنف کو عبارت آرائی سے زیادہ سروکار نہیں، لیکن ان کے مضامین باوزن اور قابل قدر ہیں۔ ترقی پسند ادب اور اس کے برتنے والوں کے بارے میں انھوں نے بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جنھیں وہ نہ بتاتے تو یہ داستان تشنہ رہ جاتی۔ سلسلۂ ذہب کی کئی کڑیاں خالی رہ جاتیں۔ چوں کہ وہ خود اسی دبستان ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس دبستان کے اکابر اہل قلم کی رفاقت اور ان کی طرف سے انسیت اور احترام انھیں میسر ہوا ہے۔ اس لیے ان کی تحریر میں "شنیدہ" کی دوری اور پھیکاپن نہیں ہے۔ "دیدہ" کا قرب اور التہاب ہے۔ وہ ترجمانی اس تحریک کی کر رہے ہیں جس میں وہ گلے گلے شریک تھے۔ مصنف کے ساتھ قارئین تیسری اور چوتھی دہائی کے اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جب ترقی پسند مصنفین ادب اور زندگی دونوں کو اپنے شدت سے محسوس کیے ہوئے نظریات کے مطابق ڈھال رہے تھے۔

راج بہادر گوڑ کی تحریر کے برعکس ان کی گفتگو رواں، شگفتہ، صاف اور دلکش ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی تحریر کو خراد اتارتے تو بات ہی دوسری ہوتی۔ ان کی گفتگو کا ذکر آگیا ہے تو دو ایک باتیں کہہ دی جائیں۔ اول تو ان کی صحبت میں انسان ناک چڑھا کر اور تیوری پر بل ڈال کر بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ ان میں ہر بلبلہ کو چھیدنے کی صلاحیت ہے۔ ان کی گفتگو دل کش اور بُراق ہوتی ہے۔ اسے دارالترجمہ والے حیدرآباد کا فیض کہیے کہ ان کا ذہن موزوں لفظ یا موزوں ترین متبادل تک ایک پل میں پہنچ جاتا ہے، اور یارانِ محفل تلاش میں سرگرداں رہ جاتے ہیں۔

گوڑ صاحب قانون کی بہت اچھی فراست رکھتے ہیں۔ اور انجمن ترقی اردو کو اردو زبان کے آئینی حقوق کے سلسلہ میں جتنے مرجوعات کرنے پڑتے ہیں ان میں بالعموم گوڑ صاحب انجمن کی

انگلی پکڑ کر اسے چلاتے ہیں۔

راج بہادر گوڑ کی شخصیت دل پذیر ہے۔ عام خیال یہ ہے اور صحیح ہے کہ وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز اور بالاتر ہیں، اس زمانہ میں بھی جب یہ سکۂ رائج الوقت ہو چلا ہے۔ یوں تو ہمارا ترقی پسند طبقہ ہی ذہنی طور پر انصاف پسند اور اقلیت دوست ہے۔ راج بہادر گوڑ کی افتادِ طبع عروس البلاد حیدرآباد سے ان کے تعلق اور شریف النفس اہلِ سیاست و اہلِ قلم اور انصاف پسندوں کی صحبت نے اس پر اور جلا کر دی ہے۔ اگر آپ کو تلاش ہو کہ بے لوث اور ٹھیٹھ ہندوستانی کسے کہتے ہیں، تو جو فہرست آپ بنائیں گے اس میں راج بہادر گوڑ کا نام ضرور شامل ہوگا کہ اس کے رگ و ریشہ پر سب سے آمیز ہندوستانی ہونے کی مہر ثبت ہے اور اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ ہر لمحہ اس کے دل کو ہندوستانیت کی صہبا نے ناب میں لہلہا رہا ہے۔ گوڑ اپنی بے نفسی

سادگی اور بے ریائی میں حسرت موہانی کی یاد دلاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس درجہ حرارت کو نہ گوڑ پہنچتا ہے، نہ ہمارے بڑے بڑے قائدین میں سے کوئی۔ تاہم حسرت موہانی کے کردار سے قریبی مماثلت کا افتخار کیا کم ہے۔

"ادبی تناظر" ۱۹ مضامین پر مشتمل ہے۔ "روشنائی" سے اس فاصلہ پر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی بنا اس کے جیالوں نے کن ارادوں، اضطرابوں اور ارمانوں کے ساتھ ڈالی اس میں شک نہیں کہ ترقی پسندوں نے اردو ادب کی دیواریں جو فرسودگی اور کجی آگئی تھی اسے بیٹھ کا سہارا دے کر سیدھا کر دیا۔ مضامین اکثر ان معاصرین کا ذکرِ خیر کرتے ہیں جو مصنف کے ہم مشرب تھے، ان میں سرِ فہرست مخدوم ہیں اور خواجہ احمد عباس، اور نیاز حیدر اور باقر زیدی بھی ہیں۔ مضامین بصیرت اور ہمدردی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ لیکن مصنف کی وسعتِ نظر اور فراخئ ترجیحات کا اندازہ بھی ان سے ہوتا ہے۔

ترقی پسند ادب عالمی تناظر اپنے ساتھ لایا، اس کی تخلیقات میں زندگی کی ندی پورے خوش و خروش کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ ان اوصاف کا انعکاس "ادبی تناظر" میں ہوتا ہے، جارحانہ نہیں شارحانہ، متعصبانہ نہیں عادلانہ انداز سے۔ یہ کتاب قارئین کے افق کو

وسیع کرتی ہوئی چلتی ہے۔ اور جو بصیرتیں اور روشنیاں وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی ہیں، وہ اس پر مستزاد۔ دیکھیے۔

"بغاوت اور انقلاب میں فرق ہی یہ ہے کہ بغاوت کے سامنے مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا اور انقلاب کے آگے سماج کی تشکیل نو کا ایک پورا منصوبہ ہوتا ہے۔"

"کسی ادب کو یا کسی ادبی دور کو اس کے اچھے اور اعلیٰ ادب کی بنا پر جانچا جاتا ہے۔"

"کرشن چندر نے اپنی سماجی بصیرت کو اپنے مقصد کو موزوں فنی ہیئت میں پیش کیا ہے۔"

"جاگیرداری سماج میں عورت محض ایک کھلونا تھی۔ سرمایہ داری نے اپنے عروج کے زمانے میں اسے آزاد تو کیا مگر وسعتِ زنجیر تک ہی۔"

"جمہوری طریقۂ کار، کھلی بحث اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا پرکھنا اور رفاہمت اور مطابقت کی راہیں تلاش کرنا انجمن کا طریقۂ کار تھا۔"

"اول تو درمیانی طبقہ کا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ تو سرمایہ دار طبقہ کی طرح سماج پر قابض ہے اور نہ مزدور طبقہ کی طرح اس پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کے خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے مذبذب اور تشکیک کی اس کیفیت میں منزل اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

"(غالب کے دور میں) پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی قدریں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آیند مستقبل کا نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں۔"

"ان (غالب) کے پاس غمِ موجود کے ساتھ نشاطِ آرزو بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔"

ترقی پسند ادب اور اس کے اہلِ قلم پر راج بہادر گوڑ کو بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس منصفانہ روش اور عالم گیر نظر اور انسان دوستی کے ساتھ جس کا اظہار "ادبی تناظر" میں کیا گیا ہے۔ ہم ان کی اس سلسلہ کی کتابوں کا انتظار کریں گے۔

پروفیسر آل احمد سرور

تاثرات

راج کی یاد آتی ہے تو اقبال کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

یہ ۷۵ سال کے ہوں یا ۸۰ سال کے یا اس سے زیادہ کے ہمیشہ جوان رہیں گے ان کی فکر جوان ہے ان کے قدم زندگی کی راہوں میں اسی جوش سے پڑتے ہیں جو جوانی کا خاصہ ہے۔ ان کی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تہذیب سے ادب سے عشق جوان ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ راج بوڑھے بھی ہو سکتے ہیں۔

ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں مئی میں دہلی سے حیدرآباد سفر کے دوران ہوئی میں جگر صاحب خواجہ احمد فاروقی، حمیدہ سلطان کے ساتھ حیدرآباد کی ایک اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے جارہا تھا۔ یہ ناگپور پر مل گئے پھر مخدوم کے اشعار اور لطائف کی بھرمار رہی وقت اچھا گذر گیا۔ اس زمانہ میں یہ حضرت راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔ چناں چہ انجمن نے جب ۱۹۵۸ء میں اردو کے حقوق کے لیے پارلیمنٹ کے ممبران سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا تو راج بہادر گوڑ ہمارے ساتھ تھے۔ دن بھر ہم ممبروں سے ملتے شام کو راج بہادر گوڑ جو پادھیا سے ملاقات کر کے لسانی اقلیتوں کے مسئلے پر پارلیمانی کمیٹی کی دن بھر کی کاروائی کی ٹوہ لگاتے۔ راج بہت اچھے وکیل ثابت ہوئے۔ پارلیمنٹ کے کئی ممبروں کو ہم خیال بنانے میں وہ بہت معاون نکلے۔

پھر انجمن ترقی اردو کی مجلس عام اور مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے انھیں دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ یہ کبھی جھنجھلاتے ہیں نہ برہم ہوتے ہیں نہ بیزار۔ یہ وہ دریا ہیں جو اپنی دھن میں بہے جاتا ہے۔ مخدوم کے یار ہی نہیں عاشق بھی تھے۔ ان کے بعد کسی سے محبت نہیں کی ان کی ایک

نظم سے اخذ کر کے مکان کا نام بھی رکھ لیا ہے۔

شخصیت باغ و بہار ہے۔ شعر ہزاروں یاد ہیں۔ اکثر جلسوں میں فریق مخالف کو انھوں نے کسی برمحل شعر سے چت کیا۔ مظفر پور میں انجمن کی ایک کانفرنس تھی مجھے ایک دن شرکت کر کے علی گڑھ واپس آنا تھا۔ چناں چہ صدارت ان کے سپرد کر کے روانہ ہونے لگا۔ ایک بقراط کارروائی آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے تھے۔ راج نے سمجھایا کہ آپ کو بھی بولنے کا موقع دیا جائے گا۔ گاڑی کو آگے چلنے دیجیے مگر یہ حضرت کہاں مانتے تھے۔ آخر راج نے یہ شعر پڑھا۔

اتنی ہی تو بس کی ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا

مجمع نے قہقہہ لگایا وہ حضرت خاموش ہو گئے گاڑی پھر آگے چلنے لگی۔

راج بہادر گوڑ ایک سیاسی کارکن بھی ہیں عام طور پر آدمی سیاست میں ڈوب جائے تو شئے لطیف اور حس مزاح سے عاری ہو جاتا ہے مگر اس کلیہ میں کچھ استثنیٰ بھی ہے۔ ان میں ایک راج بہادر گوڑ بھی ہے۔ سماجی انصاف کے علم بردار، مشترک تہذیب کے عاشق، شعر و ادب کے رمز شناس، اردو کے ایک مجاہد گویا ایک جام جہاں نما۔ دنیا انھیں دکن کے ایک جلیل القدر فرزند کی حیثیت سے ہی نہیں برصغیر کے ایک دانشور کی حیثیت سے بھی جانتی ہے۔

خدا اِن خضر طریقت کو عمر خضر دے۔

کمال الدین احمد

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ — پیکرِ جہدِ مسلسل

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہو گئے۔ ہزاروں برس پرانی دنیا میں پچھتر برس کا عرصہ کوئی لمبا عرصہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سوال یہاں صرف پچھتر برس کا نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ یہ پچھتر برس کس کے حصہ میں آئے ہیں اور اس نے ان پچھتر برسوں کو کیسے جیا ہے۔ دیکھا جائے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ یوں ہی پچھتر برس کے نہیں ہو گئے ان پچھتر برسوں کے ایک ایک لمحہ کو انھوں نے کارآمد، مفید، بامقصد اور حیات آفریں بنایا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی زندگی کے پچھتر برس ان کی نجی زندگی کے پچھتر برس نہیں ہیں بلکہ یہ پچھتر برس یہ پچھتر برس ہیں۔ رواداری اور اخوت کے پچھتر برس انسان دوستی اور بھائی چارے کے پچھتر برس، گنگا جمنی تہذیب اور روشن خیالی کے پچھتر برس، مظلوموں اور بے کسوں کے حق میں گذارے ہوئے یہ پچھتر برس، ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے پچھتر برس، انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت کرنے والے پچھتر برس۔ یہ اعزاز کسے ملتا ہے کہ ایک انسان کی زندگی بالآخر اس کے اطراف پھیلے ہوئے معاشرہ کی زندگی بن جائے۔ ایسی زندگی جینے کے لیے پتھر کا کلیجہ اور فولاد کا جگر چاہیے۔ ایسے لوگ سمٹتے ہیں تو دل عاشق بن جاتے ہیں۔ اور پھیلتے ہیں تو زمانہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شان محبوبی اس میں ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ایک بے لوث بامقصد زندگی گذاری ہے۔ اپنا ایک ایک پل اپنے اطراف پھیلے ہوئے سماج کو دیا ہے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اپنا بزرگ مانتا ہوں صرف اس لیے نہیں کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک مثالی رہنما ہیں۔ ایسے رہنما کسی بھی سیاسی پارٹی میں ہوں وہ صرف کسی مخصوص پارٹی کے نہیں ہوتے بلکہ سارے ملک کے لیے ایک اثاثہ ہوتے ہیں۔ میں ابتدا ہی سے کانگریس

پارٹی سے وابستہ رہا اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ شروع ہی سے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہے۔ لیکن میں اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی ان کی سیاسی سرگرمیوں، ملک کے لیے ان کی بے لوث خدمات اور ان کی راست بازی اور بے باکی کا قائل رہا ہوں حیدرآباد میں پولیس ایکشن سے پہلے نظام کی شخصی حکومت کے خلاف، کسانوں، مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت میں آواز اٹھانا کوئی معمولی کام نہیں تھا ایسے وقت میں روی نارائن ریڈی، مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف اس شخصی نظام کے خلاف آواز بلند کی بلکہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کا آغاز بھی کیا۔ اس وقت سابق ریاست حیدرآباد کے جو حالات تھے ان میں اس کام کا بیڑہ اٹھانے کے لیے بڑی دلیری جرأت اور حوصلہ کی ضرورت تھی۔ اس جدوجہد کے دوران انھوں نے برسوں روپوشی اختیار کی۔ جنگلوں کی خاک چھانی، صعوبتیں اٹھائیں، مشکلات سے گذرے لیکن کبھی اپنے نظریہ اور عقیدہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ مشکل حالت میں بھی انھوں نے حیدرآباد کے روشن خیال نوجوانوں کسانوں اور مزدوروں کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ طب کے پیشہ کی اہمیت اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔ ڈاکٹر گوڑ کے ساتھیوں میں کئی ڈاکٹروں نے صرف اپنے پیشہ میں خوب نام کمایا بلکہ بے پناہ دولت بھی کمائی۔ چاہتے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بھی ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر ایک خوش حال، آرام دہ اور پرسکون زندگی گذار سکتے تھے۔ لیکن ملک اور سماج کے لیے خوشی خوشی اپنی شخصی خوشحالی کی قربانی دے دی، عام آدمی کی طرح زندگی گذاری۔ عوام کے مصائب میں شریک رہے اور ان کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ یوں تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ فرد کی بیماریوں کا علاج کرنے کے بجائے معاشرہ کی بیماریوں کا علاج کرنے کی غرض سے میدان سیاست میں کود پڑے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا ابتداء ہی سے عقیدت مند اور مداح رہا ہوں لیکن آج سے بیس برس پہلے جب میں آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا چیرمین بنا تو انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن ملازمین کی ٹریڈ یونین کے صدر کی حیثیت سے بیسیوں بار ان سے ملاقاتیں رہیں۔ ملازمین کے مسائل کو جس طرح وہ پیش

کرتے تھے اور جس ڈھنگ سے وہ ملازمین کی نمایندگی کرتے تھے اس سے ان کی گہری سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا تھا وہ نری نعرہ بازی کے ذریعہ مزدوروں کے مسائل کو الجھاتے نہیں تھے بلکہ انھیں پوری دانشمندی اور دیانتداری کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کرتے تھے انتظامیہ کے تعلق سے سخت اور تنقیدی رویہ رکھنے کے باوجود وہ انتظامیہ کی دشواریوں کا بھی ہمدردانہ ادراک رکھتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ اندھی مخاصمت کو نہیں بلکہ دانشمندانہ مفاہمت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں انتظامیہ ان کی اکثر باتوں کو مان لیتا تھا وہیں ملازمین ان پر بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ ایک ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو مقام ملک میں حاصل کیا ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کی کوئی بھی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔ ڈاکٹر گوڑ نہایت اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی ہیں جہاں وہ مزدوروں اور کسانوں کے جلسوں میں گھنٹوں بول سکتے ہیں وہیں دانشوروں اور اہل علم کے سمیناروں میں بھی اسی دسترس اور اعتماد کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام اور خواص دونوں میں بے حد مقبول ہیں اور ان کی بات نہایت توجہ سے سنی جاتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بہترین پارلیمنٹرین بھی رہے ہیں۔ جن دنوں وہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے میں پارلیمنٹ کا رکن نہیں بنا تھا لیکن مختلف اہم ملکی مسائل پر پارلیمنٹ میں ان کی تحریروں، اہم ملکی مسائل پر پارلیمنٹ میں ان کی تقریروں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ انھوں نے نہایت موثر انداز میں عوام کی آواز کو پارلیمنٹ کے ایوان تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس میں وہ بے حد کامیاب بھی رہے۔ ان کی تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ جمہوریت میں اپوزیشن لیڈر کتنی اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کا رویہ تعمیری ہو۔ اگرچہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے نظام کی شخصی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے وہ سچے علمبردار رہے ہیں۔ سیکولرزم رواداری اور انسان دوستی جیسے جذبات ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں۔ حیدرآباد ہی کے حوالے سے وہ اردو زبان کے نہ صرف ایک سچے عاشق ہیں بلکہ ان کے ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ انھوں نے سینکڑوں ادبی موضوعات پر تنقیدی اور تعارفی مضامین لکھے ہیں۔ سیاست دانوں میں ادب سے ایسی گہری دلچسپی کی مثالیں ذرا کم ملتی ہیں۔ آندھرا پردیش میں بالخصوص اور ہندوستان میں بالعموم جب

بھی اردو کا کوئی مسئلہ اٹھا ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بڑی شدت کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج جب کہ ملک کی سیاست ایک بحران سے گذر رہی ہے۔ لوگ سیاسی پارٹیاں یوں بدل رہے ہیں جیسے لباس بدل رہے ہیں۔ مسلک اور عقیدے کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ شخصی الزامات لگا کر سیاسی فائدہ اٹھانے کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ جمہوریت، سیکولرازم، یکجہتی جیسے نظریات پر ضرب کاری لگ رہی ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے وسیع النظر، وسیع المشرب روشن خیال اور سچے رہنما کی موجودگی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ڈاکٹر گوڑ نے نصف صدی پہلے جس عہدہ اور نظریہ کو اپنایا تھا آج تک اس پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم ہیں۔ اس کٹھن سفر اور آزمائش میں ان کے پائے استقامت کبھی نہیں لڑکھرائے۔ دنیا میں بہت کچھ بدل گیا لیکن ڈاکٹر گوڑ نہیں بدلے۔ ہم سے تو زمانہ نے زمانہ سے ہم ہیں۔ ایسے دیانت دار اور کھرے بزرگ رہنما کا ہمارے بیچ موجود رہنا ہم سب کی خوش بختی ہے۔ پچھتر برس کے ہو جانے کے باوجود ان میں نوجوانوں کا سا جوش اور ولولہ موجود ہے۔ ہندوستانی سماج کی بہتری کے لیے آج بھی وہ ایک بھرپور اور فعال زندگی جی رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کی صحت اور توانائی بنی رہے اور وہ اسی طرح ملک اور قوم کی خدمات انجام دیتے رہیں۔

امولک رام

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ چھترویں سالگرہ پر

سبھی حساس دلوں کے لیے آج ایک سنہرا دن ہے کہ ہم میں سے ایک نامور شخصیت کی زندگی کے ۷۵ سال بیتنے پر، جس کا بیش بہا حصہ عوامی خدمت میں گذرا ہو، ان خدمات کو سراہا جارہا ہے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدمات کو بھول جانے اور یادوں کو بھلادینے کی روایت پڑچکی ہے۔ ویسے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی خدمات کو نہ بھلایا جاسکتا ہے اور ان یادوں کو کبھی بھلایا جاسکے گا۔ کیوں کہ ڈاکٹر راج اور مخدوم نے حیدرآباد کو ایک مخصوص شخصیت بخشی تھی۔ یا یوں سمجھیے کہ سرزمین حیدرآباد کے یہ ایسے سپوت ہیں جو سیاسیات کو، ادب اور منگیت کو، یہاں کی ہر تحریک کو حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے بہترین اقدار دیے۔ اسی لیے تو بیرون حیدرآباد سے شاعر اور ادیب اب بھی حیدرآباد کو کھینچے چلے آتے ہیں۔ اور پرانی یادوں اور قدروں کو تازہ کرتے ہیں۔ میرے اس مقالہ کا مقصد ان کی خدمات کا کوئی جائزہ لینا نہیں بلکہ اپنا خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ کیوں کہ میں ان سے اور مخدوم سے ابتدائی وجدان Inspiration حاصل کیا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ جو میرا ضمیر بن چکا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حیدرآباد میں ٹریڈ یونین تحریک کے مخدوم، جواد اور جھندرا کے ساتھ بانی مبانی تھے۔ اس لیے ٹریڈ یونین قائدین اور ہر پارٹی نے انھیں ٹریڈ یونین تحریک کے بھیشم پتاما کہتے ہیں۔ نئی نسل کے ٹریڈ یونین کارکنوں کو اصل میں یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اس وقت یہ کتنا مشکل کام تھا۔ نظام شاہی اور انگریز سامراج کا دور دورہ تھا۔ جب کہ عام جلسے کرنا ایک خطرناک جرم سمجھا جاتا تھا۔ راتوں کے اندھیرے میں محفوظ مقامات اور جگہوں اور قبرستانوں میں مزدوروں کے جلسہ عام رکھتے۔ وہیں ٹریڈ یونین کے رجسٹریشن فارم پر کرتے۔ مطالبات اور میمورنڈم مرتب کرتے اور ضرورت پڑنے پر ہڑتالوں کے فیصلے بھی وہیں ہوتے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں مزدور تحریک کی شروعات ہوئی۔ راج اور ان کے ساتھیوں کی لگن بے مثال تھی۔ ان دنوں یونین کا تصور مزدوروں کے لیے نیا نیا تھا۔ ہر چیز بڑے دھیرج سے سمجھانا پڑتا اور مزدوروں کی باتوں سے مسائل کو سمجھ کر ان کی رہنمائی کرنا پڑتا۔ راج کو میں نے کپڑا مزدوروں کو بڑے پیار اور دھیرج سے بات کرتے دیکھا

اس پیار کا تاثر تھا کہ مزدور اپنے گھریلو پریشانیاں بھی ان کے سامنے رکھتے اور کنبہ کا کنبہ ان کے گرد گھومنے لگتا۔ مزدوروں سے پیار کا رشتہ جو راج اور مخدوم نے جوڑا تھا اور جو پیار کیا تھا شاید ہی کوئی اور نیتا نے کیا ہو مزدور ہی کیا جن سے بھی ان کا واسطہ پڑتا ہی پیار کا رشتہ بن جاتا۔ اس لیے لوگ بھی ان پر پیار اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے۔ ٹریڈ یونین کے کام میں راج

کو اولین اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے تیار کردہ میمورنڈم، سلیس زبان میں، عام فہم اور دلیلوں کے ساتھ ہوتے۔ ان مزدوروں کو اپنے مطالبات کی واجبیت پر بھروسہ ہوتا جدوجہد کے لیے مکمل تیار ہونے اور خود سرمایہ داروں کو بھی واجبیت کو تسلیم ہی کرنا پڑتا۔ راج کی ایک اور خصوصیت ہے۔ وہ روزمرہ کے مسائل اور مطالبات کو بھی اصولوں اور نظریات کی اونچی سطح پر لے جاتے اور اس طرح جدوجہد کی بھی سطح اونچی ہو کر سماجی مسئلہ بن جاتی۔ ویسے بھی وہ اعلیٰ اصولوں کو مزدور کے سمجھ بوجھ کے لیے آسان زبان میں پیش کرتے اس پہلو میں دونوں راج اور مخدوم پر کامریڈ ڈانگے کا بڑا اثر تھا راج اور مخدوم کا اپنے ساتھیوں اور ان کے ارکان خاندان کے ساتھ برتاؤ، خصوصی ذکر کا محتاج ہے شاید یہ پرانے کمیونسٹوں کے اقدار کا ایک حصہ تھا۔ جو اب دھیرے دھیرے عنقا ہو چلا ہے۔

نصرت یاد ہے کہ راز بھی راج کو اپنے مرحوم والدین کے نمائندے تصور کرتے ہیں۔ راج، ریڈی اور راجو اپنے والد سے بھی بڑا درجہ دیتے ہیں۔ خود میرا لڑکا ڈاکٹر راہول اور لڑکی ڈاکٹر رادھیکا ان کو اپنا سمجھتے ہیں۔ میری بیوی ڈاکٹر پدما ہمیشہ سناتی ہیں کہ کیسے مخدوم ایک دفعہ یکایک ہماری شادی کی سالگرہ پر آدھمکے اور ہم کو "مدعو" کیا جب انھوں نے دیکھا کہ میں اپنے روزمرہ کے کام میں اس دن کی خصوصیت کو بھول بیٹھا تھا۔ مزدور کو منظم کرنے راج کے ہزار جتن رہتے۔ ان کے تعلیمی ... اونچا کرنے میں مدد کرتے۔ کلچرل صلاحیتوں کو ابھارنے کی مقدور بھر کوشش کرتے ... مخدوم کی سالگرہ کے موقع پر انھوں نے مزدور شعرا کا بھی ایک الگ پروگرام رکھا تھا۔ دو ایک ... ہوئے لیکن ایک بڑا پروگرام نہ بن سکا۔ پارٹی اور کمیونزم کے لیے راج کی خدمات ... بے پناہ رہی۔ مخدوم اور راج کمیونسٹوں اور انقلابیوں کے لیے ایک عظیم ورثہ چھوڑ ... سکیں گے؟ یہ میرے چند پیار اور عقیدت کے پھول ہیں جو میں اپنے گرو اور ساتھی ... بہادر گوڑ کے بھینٹ کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی

ادبی تناظر پر ایک نظر

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب اردو تہذیب کی اعلیٰ قدروں کا ایک نمونہ ہیں اور ادو تحریک تنظیم کے ساتھ ایک طویل مدت سے ذمہ دارانہ طور پر وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے متعدد موضوعات پر وقیع مضامین بھی لکھتے رہے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر دلچسپی کے ساتھ پڑھے گئے ہیں۔ "ادبی مطالعے" اور "ادبی جائزے" کے بعد "ادبی تناظر" ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا تیسرا مجموعۂ مضامین ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ۱۱ مضامین میں ڈاکٹر صاحب نے نظم و نثر کے متنوع موضوعات اور مختلف علمی و ادبی نیز قومی و سیاسی شخصیات کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ مشتے نمونہ کے طور پر بروقت تین مضامین پر تنقیدی تبصرہ کافی ہوگا۔

مجموعے کا تیسرا مضمون ہے "غالب اور جدید ذہن" اس میں مختلف جہتوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اول تو اپنے زمانے کے لحاظ سے خود غالب کا ذہن کتنا جدید تھا، دوسرے یہ کہ غالب نے موجودہ دور کے جدید ذہن پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوڑ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ

> "غالب کا دور انتہائی پیچیدہ اور پر آشوب ہے۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی قدریں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آیند مستقبل کا نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں۔" (ص۔ ۳۳)

لیکن کہ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ غالب اپنی تہذیب کی پسندیدہ قدروں کی شکست و ریخت

سے بہت ملول تھے اور وہ اپنے اشعار سے مستقبل کے لیے لوگوں کے حوصلے بڑھانا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ غالب کے خیالات میں آزادگی و خود بینی اور نشاط و رجائیت کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ "غالب نے تصوف میں پناہ لی" (ص۔ ۲۵۔ یہ ایک متضاد سی بات معلوم ہوتی ہے اور اس کا تضاد ڈاکٹر صاحب کے حسب ذیل بیان سے کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔

"وہ (غالب) مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہرداریوں سے بچ نکلنے کے لیے فلسفۂ وحدت الوجود کا سہارا لیتے ہیں۔" (ص۔ ۳۵)

بلاشبہ غالب کے بعض اشعار میں رسم زمانہ اور روایت شاعری کے مطابق وحدت الوجود کے کچھ اشارات موجود ہیں، مگر غالب کی توانا رجائیت وحدت الوجود کی اس تخیل پرستی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی جو قوائے عمل کو مضمحل کر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کا حقیقی میلان وحدت الشہود کی طرف تھا جیسا ان کی ایک مشہور غزل کے حسب ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اس موضوع پر خود گوڑ صاحب کا یہ اقرار:

"پتہ چلتا ہے کہ غالب موجودات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ اور ان کی کثافت کے بغیر لطافت تک پہنچ ممکن نہیں۔"

وحدت الوجود کے بجائے وحدت الشہود کا پتہ دیتا ہے۔

بہرحال، گوڑ صاحب نے غالب کے یہاں "تاتاری پیگن ازم" اور "لذت طلبی" کا جو سراغ کسی حوالے سے لگایا ہے وہ صحیح نہیں۔ محض چند شعروں اور مصرعوں سے وہ مطلب نہیں نکل سکتا جو غالب کے اشعار اور خطوط کے مجموعی اور عمومی مفہوم کے برعکس ہے۔ غالب بلاشبہ وسیع ترین معنوں میں ترقی پسند تھے اور گوڑ صاحب نے ان کی "تشکیک" کو "صحت مند" کے ساتھ مشروط کر کے ایک معقول بات کہی ہے۔ یہ تشکیک یقیناً قنوطیت اور کلبیت کے برخلاف رجائیت اور "نشاطِ آرزو" کی طرف مائل ہے۔ اس میں

لذت طلبی اور پیگن ازم کی گنجائش بہت ہی کم ہے، اس لیے کہ اس میں آزادگی و خود بینی کا عنصر ایک پروقار اور بہت ہی سنجیدہ جرأت رندی کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اعتراف کرکے کہ "غالب کا اسلام پر عقیدہ راسخ تھا" (ص۔ ۴۰)، ڈاکٹر گوڑ نے غالب کے یہاں اس پیگن ازم کی جسے ڈاکٹر صاحب "کفر" (ص۔ ۳۷) سے تعبیر کرتے ہیں خود ہی نفی کردی ہے، اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بجا اور درست ہے کہ غالب رسوم و قیود کی تقلید سے آزاد تھے۔ جب کہ اس قسم کی تقلیدی آبا پرستی خود اسلام میں روا نہیں اور اقبال بھی اجداد پرستی کے اس حد تک مخالف تھے کہ انھوں نے اعلان کردیا:

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

(اگر تقلید کوئی اچھا طریقہ ہوتا تو پیغمبر اسلام بھی اپنے اجداد کی (کافرانہ و جاہلانہ) روش اختیار کرتے)۔
مضمون کے آخر میں غالب کے بارے میں ڈاکٹر گوڑ نے سب سے سچی بات ان کی غزل گوئی کے عظیم الشان کارنامے کے متعلق ان لفظوں میں کہی ہے:

"غزل اونچ نیچ سے گزر کر نہ صرف زندہ رہی بلکہ زمانے کے نئے تقاضوں کی ترجمان بھی رہی اور ارتقا کی نئی سمتوں کی بشارت بھی دیتی رہی۔ غزل کو یہ راہ غالب ہی نے دکھائی تھی۔ اردو غزل کو اس حیات نو کے بخشنے میں غالب کی روایات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں غالب جدید ذہن کے معمار اولیں بن جاتے ہیں۔" (ص ۴۳)

اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب کی تاریخ میں غالب کے فکر و فن کی اصلی اہمیت یہی ہے۔ تغزل یا شاعری میں میر کی فتوحات جو بھی ہوں وہ یقیناً ہماری تہذیبی روایات کا ایک بڑا حصہ اور ورثہ ہیں لیکن عصر حاضر میں اردو شاعری اور اس کے سرمایۂ افتخار، غزل، کو جس نادر تجربے نے زندہ و تابندہ رکھا ہے وہ ایک بلند تخیل اور اس کے محکم اظہار کا وہ انداز و اسلوب ہی ہے، جس کی تشکیل سودا نے کی اور اسے ترقی غالب نے دی، جب کہ اس کی تکمیل اقبال کے ہاتھوں ہوئی۔
"آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت" میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مولانا کی

عظمت کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس میں دو نکات بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں میں:

"صحافت کا ناطہ ادب سے جوڑنے والے غالباً وہ پہلے اردو صحافی ہیں"۔ (ص ۶۳)

حقیقت یہ ہے کہ "الہلال" اور "البلاغ" کی شاندار، معنی آفریں اور سحر انگیز زبان آج کے اردو جاننے اور پڑھنے والوں کے لیے کتنی ہی اجنبی اور مشکل ہو۔ مگر بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اس کی فتوحات پر جو مشہور تبصرہ حسرت موہانی نے کیا ہے اور جس کے مطابق ابوالکلام آزاد کی نثر کو دیکھ کر نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا وہ بالکل صحیح ہے۔ گرچہ مولانا آزاد کی بہترین نثر کے کمالات بعد میں "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" کے زیادہ محکم اسلوب نگارش میں ظاہر ہوئے۔ دوسرا نکتہ بقول ڈاکٹر گوڑ یہ ہے کہ مولانا آزاد نے موجودہ ہندوستان کے سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر سے دیگر علمائے دین کے برخلاف "دارالسلام" اور "دارالحرب" کے مقابلے پر ادر دونوں کے بیچ میں "دارالامن" کے تصور کی تاریخی اجتہاد کیا۔ لیکن ڈاکٹر گوڑ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے "وحدت ادیان" کی بات کی ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ شاہ ولی اللہ نے وحدت ادیان کا تصور پیش کیا تھا۔ دراصل مولانا آزاد اور شاہ ولی اللہ دونوں نے دیگر مستند و مشہور علمائے اسلام کی طرح "وحدت دین" کے نظریے کی تشریح و توضیح کی۔ وحدت ادیان کا مطلب ہے کہ تمام مذاہب ایک اور ان کی موجودہ سب شکلیں برحق ہیں، جب کہ وحدت دین کا مفہوم یہ ہے کہ دین اصلاً ایک ہے اور وہ دین فطرت ہے جس پر حیات و کائنات کا پورا نظام مبنی ہے۔ اس ہمہ گیر دین کی تعریف قرآن کی ایک مشہور آیت میں اس طرح کی گئی ہے:

ان الدین عند اللہ الاسلام

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے

پھر اسلام کی جو وضاحت قرآن کی متعدد آیتوں سے صراحتاً ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام محض کسی ایک نسل فرقے کا مذہب نہیں ہے بلکہ خدا کا مقرر کیا ہوا وہ قانون فطرت ہے جس کی تابعداری تمام مخلوقات کو کرنی ہے۔ چنانچہ عربی میں اسلام کا لفظی معنی بھی خدا کی بندگی اور فرماں برداری ہے۔ یہ ایک نظریۂ حیات ہے۔ جو بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے ہے، جو اس کو تسلیم کرے وہ مومن

ہے، جو اس سے انکار کرے وہ کافر ہے۔ وحدتِ دین کا یہی تصور اپنے اپنے وقت میں اور اپنے اپنے طور پر شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نیز دیگر مشاہیر علماے اسلام بھی نے پیش کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے ایک سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے اس پورے مسئلے کی وضاحت خود ہی "میرا عقیدہ" کے عنوان سے کتابی شکل میں کر دی ہے۔

"مولانا محمد علی جوہر ۔۔۔ ایک خراج عقیدت اور ایک تجزیہ" میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو حقائق پیش کیے ہیں ان میں چند کا صرف بیان کر دینا یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنی وسعت نظر اور بصیرت کے ساتھ مولانا محمد علی کی شخصیت اور کارناموں کا مطالعہ کیا ہے وہ کہتے ہیں:

۱۔ "علی گڑھ تحریک اور آکسفورڈ کی تعلیم نے انھیں یہ سکھایا کہ سچائی کی تلاش اور روایت کے احترام کے درمیان آویزش نہیں بلکہ رابطہ ہونا چاہیے۔" (ص ۶۹)

۲۔ "مولانا محمد علی کی اسلام پرستی اور وطن دوستی ایک دوسرے سے ستیزہ کار نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون کار ہیں۔" (ص ۷۰)

۳۔ "مولانا محمد علی تعلیمی نظام کی صحت پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندستان میں جدید تعلیم نے "مذہب پرستی سے زیادہ فرقہ پرستی" کو فروغ دیا ہے۔ ان کی رائے میں جمہوریت کے لیے ایک صحت مند تعلیمی نظام کی سخت ضرورت ہے۔ جو عوام کے ذوق اور مزاج سے ہم آہنگ ہو۔" (ص ۷۵)

میرے خیال میں یہ سچائیاں ہیں جو کسی تبصرے اور تنقید کی محتاج نہیں۔ آج کے حالات میں انھیں مولانا محمد علی کے حوالے سے اجاگر کر کے ڈاکٹر گوڑ نے ایک علمی نیز عملی خدمت انجام دی ہے۔ یہ سچائیاں دورِ حاضر کے ہندوستانی دانشوروں کو بلا امتیاز فرقہ وطبقہ دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

"ادبی مناظر" کے تین اہم مضامین کے تجزیے سے آشکار ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب نے چند وقیع موضوعات پر فکر انگیز سوالات اٹھائے ہیں اور بصیرت افروز بحثیں کی ہیں، گرچہ ان کے بعض خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا، پھر وہ اپنے افکار کی وضاحت کے لیے بہر حال دلیلیں دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا

اندازِ نظر علمی ہے اور وہ ادبی مسائل پر بھی عالمانہ اسلوب سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ زیرِ نظر کتاب کے مضامین کی فہرست کے مدِنظر ڈاکٹر خلیق انجم نے "حرفِ آغاز" میں بالکل بجا ارشاد کیا ہے:

"گوڑ صاحب کی تحریروں کا کینوس وسیع ہے۔ انھوں نے بہت متنوع موضوعات پر مقالے لکھے ہیں۔"

ڈاکٹر انجم کا یہ خیال بھی صحیح ہے:

"ادبی تناظر ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ایسے نقاد کی تحریروں کا مجموعہ ہے جو ادب اور سیاست دونوں میدانوں کا مرد ہے، جس کا اندازِ فکر ہمیشہ متوازن اور ہمدردانہ رہا ہے اور جس نے اپنے نظریاتی مخالفوں کو برا بھلا کہنے کے بجائے بہت نرم اور مدلل انداز میں اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔"

مجتبیٰ حسین

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پچھترویں سالگرہ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہو گئے۔ یہ بات آپ اور ہم تو اس لیے مان لیں گے کہ وہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے لیکن شاید خود ڈاکٹر گوڑ اس بات کو نہ مانیں کیوں کہ راج بہادر گوڑ کسی بھی بات کو اتنی آسانی سے نہیں مانتے۔ مجھے اس وقت اپنے خاندان کے ایک بزرگ یاد آ گئے جنھوں نے ساری زندگی ہنستے کھیلتے، دھومیں مچاتے ہوئے گذار دی، نوّے سال کی عمر میں بھی ان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو عموماً نو سال کے بچے کے ہونٹوں پر دکھائی دیتی ہے۔ سچی اور خالص مسکراہٹ، مگر جب وہ اکیانوے برس کے ہو گئے اور میں ان کی سالگرہ پر مبارکباد دینے گیا تو اُداس سے نظر آئے۔ اداس کا سبب پوچھا تو کہنے لگے "میاں! زندگی کے اکیانوے برس تو چٹکی بجانے میں گزار دیے لیکن اب احساس ہونے لگا ہے کہ مجھ میں مزید بوڑھا ہونے کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔" ـــــ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس جملہ کو ادا کرنے کے بعد بھی وہ مزید چار برس تک زندہ رہنے کی گنجائش نکالتے رہے۔ اصل میں انسان کی عمر کیلنڈروں سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے احساس اور رویّہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنے جذبہ اور احساس کی سطح پر عمر کی اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں ان میں مزید جوان بنے رہنے کی خاصی گنجائشیں موجود ہیں۔ میرا اپنا حال بلکہ حالت یہ ہو گئی ہے کہ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بزرگ سمجھ بیٹھتا ہوں۔ حالاں کہ ڈاکٹر گوڑ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں میں نے غالباً اس وقت دیکھا تھا جب میں خود نو برس کا تھا۔ یہاں غالباً کا استعمال میں نے اس لیے کیا ہے کہ میں ان دنوں سابق ریاست حیدرآباد کے شہر گلبرگہ میں رہتا تھا۔ اور اپنے بڑے بھائیوں سے ملنے کے لیے کبھی کبھار حیدرآباد آجاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی حیدر گوڑہ کے ایک مکان میں

رہتے تھے۔ ایک رات مجھے بلا کر تاکید کی گئی کہ میں مکان کے اس کمرہ میں بالکل نہ جاؤں جو مکا
کے پچھلے حصہ میں واقع تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وہاں ایک مہمان آیا ہوا ہے اور اسے آرام کی سخت
ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے تو جواب میں یہ
دوں کہ کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ ایسے مہمان کو دیکھنے کی تمنا بھلا کس بچہ کے دل میں پیدا نہیں ہو
لہٰذا سخت تاکید کے باوجود میں نے چوری چھپے درازوں میں سے جھانک کر اس مہمان کو دیکا
آرام تو خیر کیا کرتا کچھ لکھنے پڑھنے میں ضرور مصروف تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ مونچھ
شاید تھیں جو پتہ نہیں اصلی تھیں یا نقلی۔ یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ جب مخدوم محی الدین،
بہادر گوڑ اور ان کے دیگر کمیونسٹ ساتھی تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں روپوشی کی زندگی
رہے تھے اور اپنے ٹھکانے بدل بدل کر اپنے آپ کو گرفتار ہونے سے بچا رہے تھے۔ میں
اوپر جس مہمان کا ذکر کیا ہے وہ ہمارے گھر میں رہا تو صرف ایک ہی دن لیکن اس کے گھر سے چ
کے پانچ چھ برس بعد کسی نے بتایا کہ اس دن جو مہمان ہمارے گھر میں رکا تھا اس کا نام ڈاکٹر راج
گوڑ تھا۔ جب مجھے اس کا پتہ چلا تو میں چودہ پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس وقت تک ڈاکٹر گوڑ
سے رہا ہو چکے تھے۔ میں اپنے دوستوں کو بڑے فخر کے ساتھ اس وقت بھی بتایا کرتا تھا اور آج
کرتا ہوں کہ ڈاکٹر گوڑ نے کبھی ہمارے گھر میں بھی پناہ لی تھی۔ اگرچہ میں آج بھی پورے وثوق کے
نہیں کہہ سکتا کہ آج سے پچاس برس پہلے جس مہمان نے ہمارے گھر میں پناہ لی تھی کیا وہ ڈا
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھے۔ میں چاہتا تو پچھلے پچاس برسوں میں اپنے بڑے بھائیوں سے اس
میں پوچھ سکتا تھا بلکہ خود ڈاکٹر گوڑ سے اس کی توثیق حاصل کر سکتا تھا۔ مگر میں نے کبھی نہیں پو
آج بھی پوچھنا نہیں چاہوں گا۔ اس لیے کہ اگر خدانخواستہ جواب نفی میں ملے تو میری زندگی
ان سے رابطہ کے عرصہ میں اچانک پانچ چھ برسوں کی کمی ہو جائے گی۔ اور میں عمر کی اس منزل میں
جہاں سینت سینت کر جمع کیے ہوئے لمحوں کو تفریق کے عمل سے گزارنا میرے لیے گھاٹے کا
فراق نے کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت کے بارے میں کہا تھا۔

؎ خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں

قصہ دراصل یہ ہے کہ راج بہادر گوڑ میرے لیے افسانہ بھی ہیں اور حقیقت بھی۔ یہ مع

میرا ہی نہیں یہ اس شخص کا ہے جس نے ملک کی آزادی سے پندرہ سولہ برس پہلے سابق ریاست حیدرآباد کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ شخصی حکمرانی کے اس دور میں جب اچھے اچھوں کے ... رہتے تھے۔ مخدوم محی الدین، روی نارائن ریڈی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں تلنگانہ کے کسانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے کر مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا اس تحریک نے اُ... وقت کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ مخدوم محی الدین کا ترانہ

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

اس وقت کے نوجوانوں میں بے پناہ مقبول ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیل سے رہائی کے مخدوم محی الدین کا جو جلوس نکلا تھا۔ اس سے بڑا جلوس میں نے آج تک نہیں دیکھا بلکہ جوں جوں میری عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے میرے حافظہ میں اس جلوس کی لمبائی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

مخدوم اور ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اور یہ دونوں کسی او... کردار لگتے تھے۔ ان لوگوں کی روپوشی کے بارے میں بھی طرح طرح کے قصے مشہور تھے جنھیں ... احساس ہوتا تھا کہ یہ اس دھرتی کے باسی ہیں۔ مثلاً مخدوم نے ایک بار اپنے ایک برہمن دوس... گھر میں پناہ لی۔ ان کا برہمن دوست تو کمیونسٹ پارٹی کا ہمدرد لیکن اس کے والدین رہ... اور کھانے پینے کے معاملہ میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ مخدوم کے دوست نے مخدوم کو... تھا کہ اس کے والدین کو ہرگز یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ مخدوم اس پر سختی سے عم... کرتے رہے۔ ایک دن کھانے کی میز پر ان کے دوست کے والد نے باتوں باتوں میں مخدو... کہا" تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرتے ہو۔ تم لوگوں کے دین وایمان کا کیا بھروسہ۔ کہیں گوشت وغیرہ تو نہیں کھاتے"

اتنا سنتے ہی مخدوم نے منہ میں جاتے ہوئے نوالے کو روکا اور کہا" نعوذباللہ لاحول... چھی چھی۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم گوشت کھاتے ہیں"

ڈاکٹر گوڑ بھی کئی نام اور کئی بھیس بدل کر روپوش رہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ بھی غا...

کی بات ہے کہ راج بہادر گوڑ ایسی ہی کسی "نعوذ باللہ" والی بات پر دھر لیے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جیل میں پہنچ کر انھوں نے کسی بیماری کا بہانہ کیا۔ (میڈیسن کے ڈاکٹر ہونے کا اتنا فائدہ تو وہ اٹھانا جانتے ہی تھے)۔ پھر یہ اکیلے بیمار نہیں پڑے بلکہ اپنے ایک ساتھی کامریڈ جواد رضوی کو بھی ساتھ لے کر بیمار پڑے (حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو اسی کو کہتے ہیں) نتیجہ میں دونوں قیدی علاج کے لیے عثمانیہ اسپتال لائے گئے۔ اپنا علاج کرنا وہ خود تو جانتے ہی تھے۔ لہٰذا دونوں کچھ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ اسپتال سے فرار ہو گئے کہ ان کے فرار ہونے کے ڈرامہ کا ذکر کئی دنوں تک حیدرآباد کے گلی کوچوں میں ہوتا رہا۔ ہماری فلموں میں بھی قیدی اس طرح فرار نہیں ہوتے جیسے یہ دونوں ہوئے تھے۔ میری نسل کے لوگوں کے ذہنوں میں مخدوم اور راج بہادر گوڑ ایک عرصہ تک افسانوی کردار کی طرح ہی رہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب یہ رہا ہوئے اور جب پہلی بار انھیں اصلی روپ میں دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ کیا یہی وہ راج بہادر گوڑ ہیں جن کے قصے الف لیلیٰ کی داستانوں کی طرح مشہور ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اصل راج بہادر گوڑ تو وہی تھے اور ۱۹۵۲ء کے بعد سے ہم جب ڈاکٹر گوڑ کو دیکھ رہے ہیں وہ اصل میں ایک بھیس بدلی ہوئی شخصیت ہے۔

معزز حضرات! آج کی محفل میں ہم جن بزرگ کی پچھترویں سالگرہ منا رہے ہیں ذرا آپ ان کے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ کیا کبھی ان ہاتھوں نے ہتھیار اٹھائے ہوں گے ان کے قریبی جاننے والے کہتے ہیں کہ ان ہاتھوں نے ضرور ہتھیار اٹھائے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اٹھائے تھے۔ میرے پاس ایک نہایت بوسیدہ اور پرانی گھڑی تھی۔ ایک بار وہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ میں اسے ٹھیک کرانے کے لیے گھڑی ساز کے پاس گیا۔ گھڑی ساز نے پہلے تو اسے حقارت سے دیکھا اور پوچھا "کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے کہا "یہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی تھی" گھڑی ساز نے کہا "جب یہ زمین پر گر گئی تھی تو آپ نے اسے اٹھایا ہی کیوں۔ وہیں پڑی رہنے دیتے"۔ ایسی ہی بات ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں ذہن میں آتی ہے کہ جب آپ کو ہتھیار ڈالنے ہی تھے تو انھیں اٹھانے کی زحمت ہی کیوں کی تھی۔ پھر ذرا سوچئے کہ کیا ان ہاتھوں نے کبھی کسی پر گولی چلائی ہوگی۔ اور اگر چلائی بھی ہوگی تو کیا گولی نشانہ پر لگی ہوگی۔ آج ان

ہاتھوں کو دیکھ کر ان کہانیوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا جو ان ہاتھوں سے منسوب رہی ہیں۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بارہ برس پہلے جب مجھے جاپان جانے کا موقع ملا تو ڈاکٹر گوڑ کے تعلق سے میری غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔ جاپانیوں کے ہاتھ بہت خوب صورت ہوتے ہیں میں ان کے ہاتھوں کو دیکھتا جاتا تھا اور گھنٹوں حیرت میں مبتلا رہتا تھا کہ کیا سچ مچ ان ہاتھوں نے دوسری جنگ عظیم میں گولیاں چلائی تھیں اور بم پھینکے تھے۔ اصل میں تاریخ مختلف ادوار میں ہاتھوں سے مختلف کام لیتی ہے اور ان کے کاموں کی نوعیت کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ چناں چہ تاریخ نے ڈاکٹر گوڑ کے ہاتھوں سے اب ہتھیار چھین لیے ہیں اور ان میں ایک قلم تھما دیا ہے کہ وہ اسے چلاتے رہیں۔ اس سے پہلے قدرت ان کے ہاتھوں میں اسٹیتھسکوپ تھمانا چاہتی تھی جسے پھینک کر انھوں نے ہتھیار اٹھا لیے تھے۔

مجھے اس وقت اپنے ایک دوست کی یاد آرہی ہے جو نہایت کم عمری میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ان کے ذمہ کام یہ تھا کہ راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں کو ہتھیار فراہم کرتے رہیں۔ ایک بار یہ اسلحے جاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ بعد میں پولس نے ایسی کڑی تفتیش کی کہ بیچارے کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس واقعہ کے کئی برس بعد انھیں علاج کے لیے سوویت یونین روانہ کیا گیا جہاں ان کی ریڑھ کی ہڈی کی مرمت کی گئی۔ وہ علاج سے مطمئن ہو کر خوش خوش واپس تو ہو گئے لیکن چند ہی برسوں میں خود سوویت یونین کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان پچھتر برسوں میں نہ جانے کتنوں کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹیں لیکن ہمارے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ریڑھ کی ہڈی اب بھی صحیح و سالم ہے۔ ورنہ ہمارے کتنے ہیرو اور کتنے محبوب تھے۔ جن کا حشر نہ جانے کیا ہوگیا۔ ایک شعر یاد آگیا۔

زمانہ کس قدر پامال کر دیتا ہے انساں کو
ہمارے دور کے محبوب پہچانے نہیں جاتے

اصل میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے موجود میں پوری شدت کے ساتھ جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ہم جیسے تو ابھی سے ساحل پر بیٹھ کر زندگی کے منجدھار کا تماشہ دیکھنے لگے ہیں۔ لیکن راج بہادر گوڑ ہیں کہ اب بھی اس منجدھار میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے پورے پچاس برس

بیت گئے۔ پچاس برس پہلے ان میں جو چیز دیکھی تھی وہ آج بھی ان کی ذات میں موجود و محفوظ ہے
اور اس شئے کو سیماب صفتی کہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے
نتیجہ میں ان کے مزاج میں بلا کی تیزی، چستی اور پھرتی نظر آتی ہے۔ جلد بازی اور عجلت ان کی
شخصیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلے سال کے اواخر میں ایک دن صبح صبح چھ بجے
میرے گھر کے آس پاس اچانک کسی کے پکارنے کی آوازیں آنے لگیں، میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ
بیٹھا تو محسوس ہوا کہ کوئی بڑی تیزی کے ساتھ میرے فلیٹ تک آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا
ہے۔ میرا مکان چوتھی منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کی رفتار اور میرا نام پکارنے کی تکرار سے یوں
لگتا تھا جیسے کوئی بھونچال سا آنے والا ہو۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
اپنی کزن مسز اودیش رانی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ بولے" ابے مسخرے اتنی دیر تک سوتا ہے۔"
میں نے کہا" ایک زمانہ تک "سرخ سویرے" کے آنے کی امید میں بہت جلدی بیدار ہو جایا
کرتا تھا۔ یہ تو نہیں آیا۔ اب جلدی جاگ کر کیا کروں گا۔"
یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی پر ایک ہلکی سی چوٹ تھی
جسے وہ بار بار سہلا رہے تھے۔ میں نے پوچھا" یہ کیا ہو گیا؟"
بولے" تمہارے گھر کے زینے کو تیزی سے طے کرنے کی کوشش میں میری پیشانی ریلنگ سے
ٹکرا گئی اور کچھ نہیں۔"
میں نے کہا" آپ کو اتنی عجلت سے سیڑھیاں چڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔"
بولے" ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اودیش رانی نے بالآخر شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا
ہے۔ چنانچہ آج سے پانچ دن بعد ان کے دولہا میاں آنے والے ہیں۔ اور چھٹے دن ہر حالت میں
ان کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے شادی میں شرکت نہ کر سکوں گا۔
لہٰذا "کورٹ میرج" کے سارے امور تمہیں طے کرنے ہوں گے۔ کنیادان بھی تمہیں کرنا ہوگا۔
میں نے کہا" گوڑ بھائی! یہ تو سب ہو جائے گا۔ مگر آپ کو سیڑھیاں چڑھنے میں اتنی جلد بازی
کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی اودیش رانی کی عمر اب پچاس برس کی ہو گئی ہے۔ جہاں
اتنی تاخیر ہوئی ہے وہاں پانچ دس منٹ کی اور تاخیر ہو جاتی تو کیا فرق پڑتا۔"

ہنس کر بولے "پیارے! پچاس برس کی عمر ہوگئی ہے اسی لیے تو عجلت نہایت ضروری تھی ورنہ تیس بتیس برس کی عمر ہوتی تو مزید سال دو سال انتظار کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں تھی"
یہ کہہ کر وہ فوراً واپس جانے لگے۔ میں نے انھیں بہت روکا کہ ناشتہ کر کے جائیں لیکن وہ بالکل نہیں رُکے۔ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے چلے بھی گئے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ایک اور خرابی نما خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے سے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں بلکہ اتنا خیال رکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد چھوٹے اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھنے کی غلطی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ چھوٹے آدمی کا بڑا پن کتنا کھوکھلا ہوتا ہے۔ یہ جب کسی کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو ڈاکٹر گوڑ نے میری مزاح نگاری کے بارے میں ایک طویل اور جامع مقالہ لکھا میری مزاح نگاری کے بارے میں اس وقت تک کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر ان کا مضمون سن کر میں ہکا بکا سا رہ گیا کیونکہ انھوں نے میری مزاح نگاری میں جو خوبیاں تلاش کی تھیں وہ خود مجھے نظر نہیں آرہی تھیں۔ چنانچہ جلسہ کے بعد میں نے ان سے شکایت کی کہ حضور آپ نے میری بہت زیادہ تعریف کردی جس کا میں مستحق نہیں تھا"

بولے "میاں! اس کو تعریف نہیں کہتے۔ ہمت افزائی کہتے ہیں ہمت افزائی"

میں نے کہا "مگر مجھ میں اتنی ہمت افزائی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے"

ہنس کر بولے "اپنی ذات میں تھوڑی سی خوش فہمی پیدا کرلو تو یہ ہمت بھی آجائے گی"

چنانچہ ڈاکٹر گوڑ کا مضمون اب بھی میرے پاس محفوظ ہے جسے میں اکثر اوقات اپنے آپ میں خوش فہمی پیدا کرنے کے خیال سے پڑھ لیتا ہوں۔ اور میری نااہلی دیکھیے کہ یہ خوش فہمی آج تک مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ یہ نہ سمجھیے کہ ڈاکٹر گوڑ نے میرے ساتھ یہ خصوصی سلوک کیا تھا۔ پچھلے تین چار دہوں میں ڈاکٹر گوڑ نے سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے اور حتی المقدور انھیں خوش فہمی میں مبتلا کیا ہے۔ ہر کوئی میری طرح نااہل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن اس وقت مجھے چند سال پہلے دسمبر کی ایک شام یاد آرہی ہے۔ حیدرآباد میں ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں

ڈاکٹر گوڑ سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ بابری مسجد کو گرے ہوئے سات آٹھ دن ہی بیتے تھے۔ ڈاکٹر گوڑ نے آتے ہی میزبان سے کہا "بھئی کھانا جلدی لگوادو۔ میں زیادہ دیر نہیں رُک سکتا۔"

میں نے کہا "گوڑ بھائی! یہ آپ نے کب سے کھانے میں دلچسپی لینی شروع کردی؟"

بولے "نہیں! مجھے پرانے شہر میں ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

میں نے پوچھا "کوئی ادبی محفل ہے؟"

بولے "دیکھ نہیں رہے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور تمھیں ادبی محفل کی سوجھ رہی ہے پرانے شہر میں ایک میٹنگ ہے بابری مسجد کے انہدام کے خلاف۔

میں نے کہا "گوڑ بھائی! بابری مسجد کے انہدام کے خلاف آپ کیا کہیں گے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن یہ بتائیے کہ آج کے حالات میں کون آپ کی عقلمندی اور ہوشمندی کی باتیں سنے گا۔"

غصہ سے بولے "کسی کو نہ سننا ہو تو نہ سُنے۔ مگر مجھے جو کہنا ہے وہ تو میں کہتا رہوں گا۔ اگر کوئی مجھے نہیں سننا چاہتا تو میں ہی اپنے آپ کو اپنی باتیں سناتا رہوں گا۔"

ایسے موڈ میں ان سے بحث کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ اپنے حلوے مانڈے سے مطلب رکھوں۔

ڈاکٹر گوڑ نے آج سے پچاس پچپن برس پہلے جس عقیدہ اور مسلک کو اپنایا تھا اس پر آج تک اسی طرح قائم ہیں۔ انسان دوستی، محبت، پیار اور رواداری کا مسلک — دنیا میں کیا نہیں ہوا۔ لیکن یہ بدستور اپنے مسلک کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ دامن بھلے ہی چاک ہوگیا ہو لیکن انھوں نے اپنے مسلک کو چاک نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر گوڑ مجھے ایک ایسے عوامی رہنما نظر آتے ہیں جو انسانوں کی بھیڑ میں تنہا رہ گئے ہیں۔ ہجوم کی تنہائی کو جو لوگ محسوس کر سکتے ہیں وہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھ پائیں گے۔ میں انھیں سچے، مخلص، بے لوث اور بے غرض رہنماؤں کی نسل کی آخری نشانی سمجھتا ہوں۔

اگر میں صاحب اقتدار ہوتا تو ایسے بچے کھچے رہنماؤں کی ایک سینکچوری Sanctuary بناتا تاکہ یہ یہاں محفوظ رہیں اور ہمارے موجودہ رہنما انھیں دیکھ لیا کریں۔ کوئی سبق تو وہ خیر کیا

حاصل کر پائیں گے۔ مگر انھیں دیکھ لینے میں کیا قباحت ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ ایک سوال میں ڈاکٹر گوڑ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ آج کے حالات میں پھر پارلیمنٹ کے ممبر بننا پسند کریں گے؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر کوئی انھیں پھر سے پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کوشش کرے تو کہیں وہ پھر سے ہتھیار نہ اٹھالیں۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ برسوں ہمارے درمیان رہیں اور ہماری ہمت افزائی کرتے رہیں۔ اور ہم میں وہ خوش طبعی پیدا کرتے رہیں جس کے بغیر آج کے دور میں زندہ رہنا دشوار نظر آنے لگا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس

ڈاکٹر گوڑ کی تنقیدی نگارشات

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شخصیت کے بنیادی اوصاف کی تلاش کی جائے تو ان کی نظریاتی وفاداری، کثیر الجہت بصیرت، بذلہ سنجی اور ذکاوت، سدا بہار مستعدی اور بے کراں توانائی کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔ وہ ہمیشہ اپنی ذات سے اور اپنے ماحول سے آمادۂ صلح رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جدو جہد میں گزرا۔ لیکن چوں کہ یہ جدو جہد اپنی ذات کی فیض رسانی کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد انسانی حقوق کی بحالی اور ظلم و استحصال کی طاقتوں سے انسان کی نجات تھی۔ اس لیے اس طویل جدو جہد اور ڈھلتی ہوئی عمر کے باوجود ان کے مزاج میں کوئی تلخی، بیزاری اور بیگانگی پیدا نہیں ہوئی۔ باطنی ہم آہنگی اور آشتی کا یہی وہ احساس تھا جس نے انھیں شعر و ادب کی طرف متوجہ کیا۔ ٹریڈ یونین تحریک اور پارٹی کی ہمہ وقتی سرگرمیوں کے باوجود وہ بڑی محویت اور دلچسپی سے اردو ادب کا مطالعہ کرتے رہے۔

اردو زبان اور اس کے تہذیبی سرچشموں سے محبت ڈاکٹر گوڑ کی خاندانی وراثت کا ایک متحرک حصہ تھی۔ ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی یہی زبان تھی۔ جو آزادی سے قبل ارض دکن کے اس خطہ میں ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد مخدوم محی الدین، عابد علی خاں، ڈاکٹر حسینی شاہد اور زینت ساجدہ جیسے احباب کی رفاقت۔ جو انھیں انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تقریبوں، جلسوں اور سرگرمیوں میں کھینچ لائی تھی۔ اس طرح تواتر کے ساتھ ان کے ادبی ذوق کی تربیت ہوتی رہی اور کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ ہم عصر ادب کے رجحانات اور مسائل سے ان کی واقفیت گہری ہوتی گئی۔

ڈاکٹر گوڑ کی ذہنی اور ادبی تربیت کا دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ دوسری قومی زبانوں کی طرح اردو میں بھی یہ تحریک شعر و ادب کی ہر صنف اور ہر حلقہ میں اپنا سکہ جما رہی تھی ۔ برطانوی سامراج اور جاگیرداری کے شکنجے سے آزادی کی جدوجہد میں یہ تحریک عوام کو ایک نیا حوصلہ بخش رہی تھی۔ اس زمانہ میں سوویت نظریہ ساز **Zhadanov** کے سوشلسٹ ریلزم کے تصور نے بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل کی جس کے تحت شعر و ادب کی تخلیق کو طبقاتی پیکار اور اشتراکی نظام کی تعمیر کی جدوجہد سے مربوط کر دیا گیا تھا۔ اردو میں بھی کچھ ادیب اور نقاد اس نظریہ کے حامی تھے۔ اس کے نتیجے میں ادب میں مارکسی نظریات کو متشددانہ اور میکانکی ڈھنگ سے نافذ کرنے کی روش بھی پیدا ہو چلی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر گوڑ کی تحریروں میں مارکسی نظریات کا اطلاق میکانکی تفہیم اور انتہا پسندانہ تعبیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس متوازن رویے کا ایک سبب شاید یہ ہو کہ انھوں نے کلاسیکی اردو شاعری کا مطالعہ بھی بڑے انہماک اور شوق سے کیا ہے اور کلاسیکی شعری روایت سے وہ کما حقہٗ مانوس تھے۔ اس سلسلہ میں مرزا غالب، میر انیس اور جلیل مانک پوری جیسے کلاسیکی مزاج کے شعرا پر ان کے مضامین کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مارکسی فکر نے انھیں معروضی تجزیہ اور علمی استدلال کی جو روشنی دی تھی اور ادبی فن پاروں کو سماجی، تہذیبی اور تاریخی حقائق کے ہمہ گیر پس منظر میں سمجھنے کا جو شعور بخشا تھا اس سے وہ دست بردار ہو گئے۔ اس کے برعکس اس شعور و آگہی نے ان کے مضامین کو تاثراتی رائے زنی کی سطح سے بلند کر کے علمی وزن و وقار عطا کیا۔

ڈاکٹر گوڑ کے مضامین اور تنقیدی تبصروں پر مشتمل اب تک تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ یعنی "ادبی مطالعے"، "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر"۔ ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً وہ مضامین جو کلاسیکی شعرا کے بارے میں ہیں۔ دوئم وہ مضامین جن کا موضوع ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہیں اور سوئم ایسے مضامین جن میں انھوں نے زبان اور ادب کے نظریاتی مسائل سے بحث کی ہے۔

ایک مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے میر انیس کی شاعری کا ایک نئے زاویہ سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کی سماجی غایت پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس سے اہم مقالہ وہ ہے جس میں انھوں نے اردو اور

تیلگو شعر و ادب پر واقعات کربلا کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے روایات سے ہٹ کر تاریخی شواہد کے حوالے سے بتایا ہے کہ دکن کی ابتدائی شاعری سے لے کر عہد حاضر تک کس طرح حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزا اور رفقا کی شہادت نے تخلیق کاروں کے فکر و تخیل کو متاثر کیا ہے۔

انھوں نے تاریخی عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اورنگ زیب کے ہاتھوں اپنے محبوب بادشاہ ابوالحسن کی شکست کے بعد دکن کے شاعروں نے اپنے غم و اندوہ کے اظہار کے لیے مرثیہ کا سہارا لیا۔ اور بہت سے سنی المسلک شعرا بھی مرثیہ گوئی میں منہمک ہو گئے۔ اسی طرح انھوں نے شواہد سے بتایا ہے کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں اودھ کی حکومت کے زوال نے وہاں عزا داری اور مرثیہ گوئی کو فروغ دیا۔ وہ مرثیوں کو تہذیبی اور عوامی معنویت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انیس کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے مضامین کو اتنی وسعت دی اور اس میں ایسی آفاقیت پیدا کی کہ وہ ایک مخصوص مذہبی دائرے سے نکل کر ہر مذہب اور ہر مسلک کے لوگوں کے دلوں کو گرمانے اور ان کو دعوت فکر و نظر دینے لگا اور یہی حق و باطل کے درمیان کربلا کے عظیم معرکے کا تقاضہ تھا۔"

ادبی مطالعہ ص ۱۲۵

"مذہبی ملاؤں کے داؤں پیچ چاہے جو ہوں عوام تو اس میں اپنی روحانی تسکین اور تہذیبی آسودگی کی راہیں نکال لیتے ہیں۔ اس طرح واقعات کربلا میں ہندوستان کے عوام نے حق کے لیے قربانی کی عظیم مثال دیکھی اور اس سے اپنی تہذیبی تخلیقیت کو نئی آب و تاب دی۔" ص ۱۳۵

اپنے مضمون "غالب اور جدید ذہن" میں ڈاکٹر گوڑ ان عوامل اور ان عناصر کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ جو مرزا غالب کو جدید احساس و آگہی اور دانش و فکر کا پیش رو بناتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

" غالب ناموافق اور نامساعد حالات دہر سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں۔ ان کا انھیں غم ضرور ہے لیکن غم انھیں ترک دنیا کی طرف نہیں لے جاتا۔ زندگی سے مایوس نہیں کرتا بلکہ " اچھے حالات" کے تصورات ان کے لیے نشاط کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

ان کے پاس غم موجود کے علاوہ نشاط آرزو بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔" ادبی مناظر ص۲۶

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گوڑ کے تنقیدی روّیے کی کچھ اصولی بنیادیں ہیں۔ جن کا اطلاق وہ قدیم کلاسیکی اور معاصر دونوں زمانوں کے تخلیق کاروں پر یکساں قدرت سے کرتے ہیں۔ وہ فن کار کے ذہنی جذباتی اور تخلیقی روّیوں میں ایسے اوصاف و عناصر تلاش کرتے ہیں جو انسانیت کی نجات کے اعلیٰ آدرشوں سے ہم آہنگ ہوں۔

معاصرین میں یوں تو انھوں نے ان گنت شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، نیاز حیدر اور ظفر گورکھپوری شامل ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کے سب سے اہم مضامین شاید وہ ہیں جو انھوں نے مختلف موقعوں پر مخدوم محی الدین کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ انھوں نے مخدوم کو زندگی کے ہر دور میں بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اپنے ان مضامین میں ڈاکٹر گوڑ نے مخدوم کا عہد، ان کی زندگی ان کی جدوجہد اور ان کی شاعری میں ایک سلسلۂ ارتباط و عمل تلاش کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دس بارہ سال پہلے کے لکھے ہوئے ان مضامین میں انھوں نے کمیونسٹ پارٹی اور بعض افراد کی افسوسناک کمزوریوں کو بے نقاب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اس طرح بڑی جرأت اور دیانت سے انھوں نے مخدوم کے اس کردار کو ابھارا جس کی شفاف پرچھائیاں ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"۱۹۵۰ء کے اواخر اور ۱۹۵۱ء کے اوائل میں پارٹی کے اندر پالیسی کے تعلق سے سخت بحث چھڑ گئی تھی۔ مخدوم جو پہلے فروری ۱۹۴۸ء کی پارٹی کانگرس کی لائین اور بی۔ ٹی۔ رندیوے کی تاویلات سے بالکلیہ اتفاق کرتے تھے ۱۹۵۰ء کے وسط سے یہ سوچنے لگے کہ پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور پھر تلنگانہ میں ہتھیار بند جدوجہد جاری رکھنے پر بھی شبہ کا اظہار کرنے لگے۔ چناں چہ اس بنا پر اس زمانہ کی پارٹی قیادت نے مخدوم کو نظر انداز کرنا شروع کیا اور یہ پارٹی کا وطیرہ سا بن گیا تھا کہ جو بھی پالیسی کے صحیح ہونے پر شبہ کا اظہار کرتا خود اس پر شبہ کیا جانے لگتا۔ اور اسے الگ

کر دیا جاتا۔ اس زد میں مخدوم بھی آ گئے۔ اور یہ مخدوم کے لیے سخت کرب اور آزمائش کا دور تھا۔ اسی زمانہ میں ۲۴ اپریل ۱۹۵۱ء کو میں راج کونڈہ کی پہاڑیوں میں گرفتار ہوا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد مخدوم حیدرآباد میں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ بھی یوں ہوا کہ ایک صاحب نے جو پولس ایکشن کے بعد رضاکار دور کے اپنے کرتوتوں کی بنا پر پولس کے عہدے سے معطل کر دیے گئے تھے۔ اپنی بازماموری کے لیے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہی مخدوم کو گرفتار کروایا۔ لیکن ان کی اس غداری کا ان کی بیوی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ بیمار ہو گئیں اور پھر جانبر نہ ہو سکیں۔ مخدوم کا نام لیتے ہوئے مر گئیں۔"

ادبی مطالعے ص۵

ان مضامین کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں۔ گزشتہ پچاس سال میں آندھرا پردیش کے محنت کش عوام نے جو سیاسی اور انقلابی لڑائیاں لڑی ہیں مخدوم اور ڈاکٹر گوڑ نہ صرف اُن میں برابر کے شریک رہے ہیں بلکہ اکثر موقعوں پر رہنمائی بھی کی ہے۔ روپوشی اور قید و بند میں بھی دونوں اکثر ساتھ رہے۔ ان مضامین میں اس جدوجہد کی دلچسپ اور مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ پھر یہ کہ اس عہد میں مخدوم کا تخلیقی سفر بھی جاری رہا۔ ان مضامین میں مخدوم کی بے شمار نظموں کے محرکات اور ماخذوں کا پتہ بھی چلتا ہے مثلاً حویلی، قید، آخر شب اور چارہ گر جیسی نظمیں۔ صرف یہی نہیں ڈاکٹر گوڑ ان نظموں کے ایسے علامتی مفاہیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی طرف عام قاری کا ذہن مشکل سے جاتا ہے۔ مثلاً 'چارہ گر' کے درج ذیل مصرعے نقل کر کے وہ لکھتے ہیں۔

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے۔

"یہاں وہ کمیونسٹ رہنماؤں کے اس قبیلے پر چوٹ کرتے ہیں جن کو اپنی ہمہ دانی پر ناز ہے۔ اور جو سمجھتے ہیں کہ ہر مسئلے کا حل ان کے پاس موجود ہے۔"

ادبی تناظر ص۹۲

رسمی اوزاروں کے بجائے ایک سلجھے ہوئے قاری کی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ مثال کے طور پر اپنے مضمون "جمالیاتی حسن" میں وہ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ جمالیاتی مسرت کا سرچشمہ وہ ترتیب و آہنگ ہے جو زندگی میں قدرت کے نظام میں یا فن و ادب میں ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ حسن و جمال کی سماجی افادیت کو بیان کرنے کے لیے بوجھل اکسی اصطلاحات کا سہارا نہیں لیتے۔ اسے ایک دوسرے سادہ اور عام فہم انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محنت اور اس کے مقصود سے انسان کا جذباتی لگاؤ اس کے وجود میں ایک خاص دل بستگی پیدا کر دیتا ہے۔ محنت کرنے والا ایک چیز تیار کرتا ہے۔ اس کی افادیت اور اس کی متناسب بناوٹ دونوں ہی اسے حسین بناتی ہیں۔ لوگ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور بنانے والے کی محنت کی داد دیتے ہیں بس یہی وہ وصف ہے۔ جو محنت کرنے والے اور محنت کے موضوع کے درمیان جذباتی لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ یہی لگن اور لگاؤ جمالیاتی انبساط کا داخلی سرچشمہ ہے۔

اپنے مضمون 'ادب اور تصوف' میں وہ متصوفانہ شعر و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک کی عوامی اور مزاحمتی تحریکوں سے اس کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ مثالوں کے ساتھ وہ بتاتے ہیں کہ اس تحریک نے ایک طرف ایک رابطہ کی عوامی زبان کو فروغ دیا تو دوسری طرف مختلف مذہبی اور نسلی گروہوں کے درمیان اتحاد و یک جہتی کے تصور کی آبیاری کی۔ ڈاکٹر گوڑ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

> "اسلامی وحدانیت کی تعلیمات پر ہندو ویدانت کا پانی چڑھا کر صوفیوں اور بھگتوں نے ایک زبردست فکری لہر دوڑا دی جس نے تصوراتی اور عملی دونوں سطحوں پر عوامی اتحاد اور قومی یک جہتی کو بڑھاوا دیا۔ صوفیوں اور صوفیانہ ادب کے اس کارنامے کو ہندوستانی قومی یک جہتی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔"
>
> ادبی مطالعہ ص ۱۹۷

ایک دوسرے مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے جدیدیت کی تعریف متعین کرتے ہوئے حقیقت پسندی کی روایت سے اس کی آویزش پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ جدیدیت کے بعض حامیوں کی طرح وہ یہ مان کر چلتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ تہذیب بحران کا شکار ہے۔ اس کے عہد عروج کی قدریں

اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے بجا طور پر مخدوم کو محنت اور محبت کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور دلائل سے بتایا ہے کہ مخدوم کی سیاسی اور شاعرانہ شخصیت کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کی انقلابی جدوجہد میں شرکت اسے مردِ آہن بناتی ہے۔ لیکن خلوت میں انسان کی غریبی، غلامی اور غم و اندوہ کے بارے میں سوچ کر اس کا دل موم ہو جاتا ہے۔ یہی جذبہ انسان دوستی کے غنائی نغموں میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مخدوم نے محنت اور محبت دونوں ہی کو محروم اور مجبور دیکھا ہے۔ دونوں ہی کو مصروفِ جہاد دیکھا ہے۔ اس لیے وہ دونوں ہی کی جیت اور کامرانی کی دعا کرتے ہیں۔ یہی مخدوم کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ مخدوم کے ہاں پرچمِ عشق اور علمِ بغاوت ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ وہ قلم کو تلوار اور تلوار کو قلم میں تبدیل کر دینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں انقلابی مزدور تحریک کی مصروفیتیں اور شعری تخلیق کی خلوتیں ایک دوسرے سے ستیزہ کار نہیں بلکہ ایک دوسرے کی شریک کار ہیں۔" ادبی مطالعہ ص۹۱

مخدوم کے علاوہ دوسرے معاصرین پر لکھے ہوئے مضامین بھی سرسری نہیں ہیں۔ یہاں بھی ڈاکٹر گوڑ کے تنقیدی رویے میں علمی تلاش و جستجو کا رجحان حاوی نظر آتا ہے۔ وہ تخلیق کی اندرونی صداقتوں کو معروضی سچائیوں کے تناظر میں دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح کہ قاری ان کے حکیمانہ لیکن شگفتہ استدلال کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا آزاد، اکبر الہ آبادی، سروجنی نائیڈو کے بارے میں ان کے مضامین۔

ڈاکٹر گوڑ نے اگرچہ نظریاتی مضامین کم لکھے ہیں لیکن جو چند مضامین ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ وہ فن و ادب کے حوالے سے ان کے پاکیزہ اور متوازن ادبی ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں یہاں بھی انھوں نے بعض دوسرے مارکسی نقادوں کی طرح کوئی میکانکی رویہ نہیں اپنایا اور نہ ہی ایسی فلسفیانہ موشگافیاں کی ہیں۔ جو عام قاری کی فہم سے ماورا ہوں۔ حالاں کہ مارکسزم کا مطالعہ انھوں نے جس دقتِ نظر سے کیا ہے وہ بجا طور پر اس کی صلاحیت رکھتے تھے کہ جدلیاتی یا تاریخی مادیت کے حوالے سے فن و ادب کے سرچشموں کا سراغ لگائیں لیکن انھوں نے نقاد کے

شکست وریخت کے عمل سے گزر رہی ہیں۔ نتیجہ میں حسّاس فنکار بے یقینی پراگندگی، خوف، سراسیمگی تنہائی اور بیگانگی کے روحانی کرب سے گزر رہا ہے۔ لیکن یہ کل حقیقت تو نہیں ہے۔ اگر ایک تہذیب مر رہی ہے تو ایک نئی تہذیب ابھر بھی رہی ہے بشکست آرزو اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ خواہشوں کی تکمیل کے نئے امکانات بھی جنم لے رہے ہیں۔ وہ وجودی فلسفہ پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ماضی پرستی اور موت کا ہمہ گیر احساس زندگی کے حسن اور حرکت کے شعور سے محروم کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

اگر ہمارے ذہن پر ماضی مسلط رہے اور حال پر اس کے مہیب سائے پڑتے رہیں تو مستقبل نظروں سے اوجھل رہے گا۔ ناآسودگی چھائی رہے گی اور ممکن الحصول کی کشمکش بے سود معلوم ہوگی۔ یہیں سے بیزاری، یاس اور ناامیدی کا شدید غلبہ شروع ہوتا ہے اور وہ مریضانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو فنکار کو تخلیقِ فن کی امید افزا وادیوں سے دور کر دیتی ہے۔"

(ادبی مطالعے ص ۲۰۸)

یہ مضمون سولہ سال قبل لکھا گیا تھا۔ اس دوران جدیدیت کی تحریک مسلسل رو بہ زوال رہی۔ نئی پیڑھی کے ادیبوں نے جدیدیت کے توانا اور صالح عناصر سے استفادہ کرتے ہوئے معاصر زندگی کی سچائیوں سے آنکھیں چار کیں اور اس طرح ادب میں ایک نئی حقیقت پسندی اور ایک نئے جمالیاتی شعور نے فروغ پایا جو توازن، ہم آہنگی اور دردمندی کے اس جذبہ سے معمور ہے جس کی طرف ڈاکٹر گوڑ نے اپنے مضامین میں اشارہ کیا ہے اور جو اُن کی عملی تنقید کی بنیاد ہے۔

مارکسی ادیبوں کے تنقیدی مضامین کی نثر اکثر بڑی بے کیف اور خشک ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر گوڑ کی تحریروں میں وضاحت اور روانی کے ساتھ تازگی اور شگفتگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان کے مطالعہ کی وسعت اور تجزیاتی قوت ان کے مضامین کو استناد عطا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے ذاتی تجربہ اور ذاتی مشاہدہ کے بیان سے مضامین میں دلچسپی کے نئے عناصر پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب جب کہ پارٹی میں ان کی عملی سرگرمیاں برائے نام رہ گئی ہیں وہ اپنے ادبی اور تنقیدی مشاغل کو زیادہ وقت دے سکیں گے۔

رفعت سروش

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ’ادبی تناظر‘ کے آئینے میں ایک جائزہ

حیدرآباد۔ فرخندہ بنیاد ۔ وہ شہر جس کی بنیاد قلی قطب شاہ کی محبت نے رکھی تھی ۔ نظام تک آتے آتے ایک ایسا شہر بن گیا تھا جہاں اپنے وقت کا سب سے دولت مند شخص حکمراں تھا۔ وہ شہر تھا والی ریاست کی شان وشکوہ کے ناروا اظہار کا۔ وہ شہر تھا نظام کے نوکرشاہی اور ”نواز جنگوں“ کے تمول اور ان کے خوشامدانہ مزاج کے فروغ کا۔ وہ شہر تھا جاگیرداریت کے عروج اور رعیت کے زوال کا۔ غریبوں کے استحصال اور مزدور پیشہ طبقہ کی بدحالی کی نمائش کا ـــــ وہ شہر تھا حساس دلوں میں جوہر غیرت پیدا کرنے کا۔

ہندوستان میں برطانوی سامراج کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ ملک میں عوامی تحریکیں مختلف پارٹیوں کی سرکردگی میں سربلند کر رہی تھیں۔ مزدور اور کسان اپنا حق مانگ رہے تھے ـــــ مگر حیدرآباد ـــــ وہ نظام شاہی کے بوجھ تلے اس قدر دبا ہوا تھا کہ مزدوروں کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

۴۱ء سے ۴۶ء تک ادھر ادھر اضلاع میں چھوٹے چھوٹے پیمانے پر مزدوروں میں بیداری کی لہریں اٹھیں اور مزدوروں نے ہڑتالیں کیں ـــــ ہڑتال استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف مزدور کا پرامن ہتھیار رہے۔ اس سے حکومتوں کی بنیادیں ہل گئی ہیں ۔ ؎

گولہ بارود ایٹم بم فولاد و آہن ایک طرف
اور ہڑتال کا عزم راسخ ایک طرف

آخر نظام شاہی کے قلعے میں پہلی دراڑ پڑی اور ۱۶ اگست ۴۶ء کو آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کی بنیاد رکھی گئی ـــــ اس کے صدر مقرر ہوئے شعلہ نوا شاعر مخدوم محی الدین جو اس وقت ۳۸ سال کے تھے اور جنرل سیکریٹری بنائے گئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ـــــ ایک پرجوش نوجوان جن کی عمر اس وقت صرف ۲۸ سال تھی ـــــ ظاہر ہے اس وقت تک وہ عوامی تحریکوں میں جوش و خروش سے حصہ لے چکے تھے۔ اور ان کی فہم و فراست اور لیڈرانہ سوجھ بوجھ کا چرچا عام ہو چکا تھا۔

آج ہم اس باحوصلہ، باعمل، جوہر کامل اور پیکر علم و عمل کا بہتر واں جشن سالگرہ منا رہے ہیں۔ جس نے عمر عزیز کا بہترین حصہ ملک کی آزادی، عوام کی فلاح، عوامی تحریکوں کے استحکام اور کئی نسلوں کی تربیت میں گزارا اور ساتھ ہی علم و ادب کے میدان میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے۔ ڈاکٹر گوڑ آج ۷۵ سال کے ہو گئے ہیں۔ مگر ان کے عزم و استقلال، ہمت اور حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ زندگی کے مختلف موریوں پر کام کر رہے ہیں۔ اور اپنی باغ و بہار شخصیت سے ہر شعبۂ حیات میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتے ہیں ـــــ ان کے عمل کی جولان گاہ عوامی جلسے بھی ہیں اور پارلیمنٹ ہاؤس بھی۔ ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں ہوں، یا انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو کے جلسے۔ وہ ہر جگہ فعال نظر آتے ہیں۔

وہ زندگی کو مارکسی شعور کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں اس لیے ان کے مضامین گنجلک نہیں ہیں۔ فکری قلابازیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک صاف اور واضح نقطۂ نظر ہے جو ان کی ہر تحریر میں نمایاں ہے ـــــ اپنی دیگر مصروفیات کے علاوہ انھوں نے اردو میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا میدان تحقیق نہیں۔ زندگی کی تفہیم ہے۔ اور یہی تفہیمی رویہ ان کی زیر نظر کتاب 'ادبی تناظر' میں جلوہ گر ہے۔ "ادبی تناظر" میں مختلف نوعیتوں کے ۱۹ مضامین ہیں۔ ان سب مضامین میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے زندگی کی اعلیٰ اقدار پر یقین۔ بہتر زندگی کی تلاش اور نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا جذبہ ـــــ ان مضامین سے لطف اندوز ہونے اور کچھ اخذ کرنے کے لیے انھیں اسی طرح پڑھنا ہوگا کہ یہ ایک مجاہد آزادی اور انقلابی شعور کے پروردہ شخص کے قلم سے نکلے ہیں۔ ان میں پیشہ ورانہ نقادوں جیسا رویہ نہیں ہے کہ بات چبا چبا

کر کی جائے۔ کہیں کمنٹ نہ کیا جائے اور ابہامی کیفیت کو برقرار رکھا جائے۔ گوڑ صاحب نے جو کچھ کہا ہے کھل کر کہا ہے۔

اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون "سید سجاد ظہیر کی روشنائی" پر ہے جو دراصل ترقی پسند تحریک کے پس منظر، اس کے پھیلاؤ اور اس کے نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ اور جو کچھ "روشنائی" میں نہیں لکھا گیا اس کی طرف بھی گوڑ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اور دراصل یہی وہ حصہ ہے جہاں گوڑ صاحب کا صاف ذہن روشنی دکھاتا ہے۔ انھوں نے بجا طور پر کہا ہے۔

"ترقی پسند ادبی تحریک و تنظیم فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو جس قدر اس تحریک نے آگے بڑھایا ہے اور لکھنے والوں کی ایک پوری پود کو کھڑا کر دیا ہے۔ ایسا ادبی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ہوا اور وہ بھی دو دہوں کے انتہائی مختصر عرصے میں ــــــ لیکن ۱۹۵۳ء کے بعد اس تحریک کو بہت سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اور اس زمانے کا صحیح اور مستند محاسبہ ابھی تک شاید نہیں ہو سکا ہے۔"

اپنے اس مضمون میں گوڑ صاحب نے بہت صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اب ترقی پسند تحریک کو کیا کرنا چاہئے ــــ لکھتے ہیں :

"فرد کو پھر سے ذہنی طور پر سماج سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ پھر فرد کو اس مجہول انفرادیت سے آزاد کرنا ہے جو سماج سے کٹ جانے اور اجنبی بن جانے پر اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور جس کا وہ آج اسیر ہے۔ فرد اپنے آپ کو بدلنا چاہتا ہے تو اسے سماج کو بدلنا ہوگا۔"

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا یہ مضمون ۱۹ ؍ جون ۱۹۷۸ء کا لکھا ہوا ہے اور آج جولائی ۱۹۹۳ء میں عالمی سیاست اور انسانی سماج کا وہ منظر نامہ نہیں ہے جو اب سے پندرہ سال پہلے تھا۔ اس لیے گوڑ صاحب کے اس نظریہ پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے ان کی اپنی رائے بھی کسی قدر بدل گئی ہو۔ اس کتاب کی روح دراصل مخدوم والا مضمون ہے۔ عنوان ہے۔

مخدوم ایک پہلو دار شخصیت : حیدرآباد کی سیاسی تحریکات کا پس منظر :

اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد اور مخدوم لازم و ملزوم ہیں اور خود راج بہادر گوڑ اس مثلث کا تیسرا ضلع ہیں۔ مخدوم کی زندگی، ان کے محرکات شاعری، ان کے سیاسی انہماک اور عوامی تحریکوں سے والہانہ وابستگی کو گوڑ صاحب نے نہایت خوبی سے واضح کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود گوڑ صاحب اس جدو جہد اور مخدوم کے ہم قدم رہے ہیں۔ چاہے ہڑتالیں ہوں، قید و بند کی صعوبتیں ہوں یا انڈرگراؤنڈ رہ کر کمیونسٹ پارٹی کے کام کرنے کی تفصیلات ـــــ "مخدوم فہمی" میں یہ مضمون کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری کے جو ادوار گوڑ صاحب نے مقرر کیے ہیں وہ بہت معنی خیز ہیں۔ بنگلہ شاعر قاضی نذرالاسلام سے متاثر مخدوم۔

آگ ہوں، آگ ہوں، ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ۔ بس اب آگ لگا نے دے مجھے

پھر گلی سڑی جاگیرداریت کی تمثیل۔ مخدوم کی نظم۔ "حویلی"

اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا، جس طرف دیکھو کھنڈر

پھر ان کی نظم۔ "جہانِ نو" ـــــ اور پھر تلنگانہ تحریک۔

۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مسلح جدوجہد شروع ہونے کے بعد وجے واڑہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں پرٹیالا کو آزاد کرانا ـــــ اور "جمہوریہ پرٹیالا" کا جھنڈا مخدوم کے ہاتھوں لہرایا جانا ـــــ ایک جوش و خروش پیدا کرنے والا واقعہ ہے۔ پھر مخدوم اور جیل کی سلاخیں۔ اور ۵۱ء میں اس عوامی ہیرو کی جیل سے رہائی۔ زبردست عوامی استقبال۔ پارلیمانی الکشن ہارنا۔ مگر ضمنی الکشن میں کامیاب ہوکر اسمبلی میں پہنچنا ـــــ اور تہلکہ خیز تقریریں کرنا ـــــ یہ سب کچھ راج بہادر گوڑ نے بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ گوڑ صاحب نے ایک بہت اہم بات لکھی ہے کہ مخدوم نے ۵۳ء سے ۵۶ء تک ایک بھی شعر نہیں کہا۔ اور پھر میدان شاعری میں وارد ہوئے تو ہلکی پھلکی غزلیں لیکر۔ مخدوم کی شاعری میں یہ جمالیاتی موڑ ایک خاص ادبی اہمیت رکھتا ہے۔

گل ہیں قندیل حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخر شب

گوڑ صاحب کے ساتھ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مخدوم ہماری تاریخ میں اور ادب میں زندہ رہیں گے۔

راجندر سنگھ بیدی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے گوڑ صاحب نے بیدی کے فن کا خوب صورت تجزیہ کیا ہے۔ دراصل ان کا یہ تجزیہ نئی کہانی کا دستور قرار دیا جا سکتا ہے۔

پریم چند نئی کہانی کے رہنما ہیں۔ انھوں نے داستان کی تخیلی اڑان کی فضا سے کہانی کو زمین پر اتارا۔ اس سے دھرتی کی سوندھی خوشبو آنے لگی۔ دھرتی کے باسیوں کی معصوم لیکن ناآسودہ آرزوؤں کی تڑپ اور فرد اور سماج کی آویزش، افلاس کے کرب میں خوش حالی کے خواب، یہی کچھ تو نئی کہانی کا مواد ہے۔ کہانی نے داستان کے پھول پتوں کے جڑاؤ چمک دمک والے سہارے کو ترک کر دیا اور زبان میں بھی ارضیت اور اس کا روزمرہ آگیا۔

کہانی کے اس سفر کا ایک عظیم رہنما راجندر سنگھ بیدی ہے۔ اس کے پاس بھی وہی فرد اور سماج کی آویزش ہے۔ لیکن انداز دھیما اور رکا تھا سا۔ کرشن چندر کی نہ گھن گرج ہے اور نہ ہی شاعرانہ تمکنت ـــــ راجندر سنگھ بیدی کے پاس ارضیت اور عصریت کے ساتھ وہ ڈرامائی خصوصیت بھی ملتی ہے۔ جس میں کردار ابھرتے ہیں اور پڑھنے والے پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جلیل مانک پوری پر بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ مگر اس میں داغ اور امیر مینائی زیادہ ہیں۔ اور جلیل بہت کم۔ گویا جلیل کے پس منظر پر نظر زیادہ گئی ہے اور جلیل سے ملاقات کم ہوتی ہے۔ ایک اشارہ کرتے ہوئے گزر گئے ہیں گوڑ صاحب۔

"جلیل درباروں میں رہے۔ شاہوں اور شہزادوں کو مشورۂ سخن دیتے رہے"۔

اگر گوڑ صاحب جلیل کی درباداری اور شاہوں کی استادی سے کچھ پردہ اٹھاتے تو واقعی لطف کی بات ہوتی۔ معلوم تو ہوتا کہ شاہوں اور شہزادوں نے کیا سلوک کیا استاد کے ساتھ ـــ اور اس سے خود جلیل کی افتادِ طبع پر روشنی پڑتی۔

سروجنی نائیڈو پر مضمون معلومات کا ذخیرہ ہے۔ کچھ بڑے لوگوں کے مشورے بہت دلچسپ ہیں ـــ گوپال کرشن گوکھلے نے ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں سروجنی کی انگریزی تقریر سن کر کہا۔

سروجنی کو سننا انتہائی اعلیٰ درجے کی ذہنی تفریح ہے۔"
گاندھی جی نے سروجنی نائیڈو کو مشورہ دیا تھا۔
"غریب تک غریب ہی کی سوچ کی مدد سے پہنچنے کی کوشش کرو۔"
اور خود سروجنی نائیڈو نے ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے قتل کے بعد لکھنؤ سے جو تقریر نشر کی اس کی معنویت آج پہلے سے زیادہ ہے۔
"بجی سوگ کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ چھاتیاں پیٹنے اور بال نوچنے کے دن بھی اب نہیں رہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم کھڑے ہو کر ان لوگوں کو للکاریں جنھوں نے مہاتما گاندھی کی نافرمانی کی ہے۔"

اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک مختصر سا مضمون ہے۔ جس میں ان کے پیامِ اتحاد کو سراہا گیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر والے مضمون سے مولانا کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی تشکیل میں ان کی بہادر ماں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور وہ خود ایک جیالے مجاہدِ آزادی اور بے باک صحافی تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی — مگر خلافت تحریک پر گوڑ صاحب نے کھل کر نہیں لکھا۔ اس لیے یہ مضمون بہت تشنہ محسوس ہوا۔

خواجہ احمد عباس کو گوڑ صاحب نے مناسب خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، عباس کی زندگی کا خاکہ، ان کی ہمہ جہت مصروفیات، ان کی صحافت، افسانہ نگاری اور ناول نگاری — ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے اس مختصر مضمون میں اور یہی گوڑ صاحب کا کمال ہے۔

مرزا غالب پر گوڑ صاحب نے قلم اٹھایا ہے مگر اس قلم میں دوسروں کی روشنائی زیادہ بھری ہے۔ دیگر کئی نقادوں کے مضامین کے اقتباسات سے یہ مضمون مزین ہے۔ بہر حال مطالعہ کا پہلو یہ ہے کہ غالب جدید ذہن کے مالک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر لکھنا تو ہے غالب پر ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

گوڑ صاحب نے پروفیسر محمد مجیب کے ایک سوال کو دہرایا ہے۔
"آخر غالب پر سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اصلاحی تحریکوں کا اثر

کیوں نہیں پڑا۔"

یہ سوال آج بھی جواب چاہتا ہے کیا اچھا ہوتا اگر گوڑ صاحب اس سوال کو ذہن میں رکھ کر غالب کا تجزیہ کرتے۔

نئے لکھنے والوں پر لکھنا دراصل مستقبل کے درخشاں کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس نکتہ سے واقف ہیں۔ وہ عام زندگی میں بھی نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں سے گھل مل کر بات کرتے ہیں۔ اس کتاب میں کئی نئے ناموں کو گوڑ صاحب نے اعتبار کی سند دی ہے۔ مثلاً حیدرآباد کے نقاد مجیب الرحمان۔ بمبئی کے مزدور طبقے کا شاعر۔ ظفر گورکھپوری۔ حیدرآباد کی نوجوان افسانہ نگار قمر جمالی، لکھنؤ کا شاعر۔ ڈاکٹر علی باقر زیدی۔ اس کے علاوہ ایک لاابالی ترقی پسند شاعر نیاز حیدر پر ان کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔

نیاز حیدر بڑا جوشیلا شاعر تھا۔ ڈرامہ نگار تھا۔ اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر وہ ایک رند مشرب شخص تھا۔ وہ خود پرست نہیں "خود شکن" تھا۔ اپنے آپ کو طرح طرح سے تباہ کرتا رہا مگر زندگی اس سے اپنا فن منواتی رہی اور وہ مختلف کیفیتوں میں لکھتا رہا ـــــ گوڑ صاحب کے مضمون سے یوں معلومات میں اضافہ ہوا۔

"۵۱۔۵۲ء میں تو ہم نے نیاز حیدر کو اردو کی معیاری کتابوں کی گٹھری لیے، انھیں بیچتے دیکھا ہے۔"

اور یہ بھی کہ "پہلے اس کا تخلص ناکام تھا بعد میں اسے ترک کر دیا۔"

نیاز حیدر ایک سیماب پا شخص تھا۔ گوڑ صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

"نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری کا ارتقا صدی کی پانچویں دہائی سے آٹھویں نویں دہائی تک برابر ہوتا رہا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ نیاز حیدر کو اگر کام کرنے کی صحیح سمت ملتی تو وہ سماج اور ادب کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اس کی زندگی اردو شاعری کا ایک المیہ ہے۔ اور اس کا تخلص ناکام صحیح تھا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے نیاز حیدر پر مضمون لکھ کر اس قرض کا بوجھ ہلکا کیا ہے جو اردو تنقید کے سر ہے ـــــ اتفاق سے کچھ ماہ پیشتر میں نے بھی نیاز حیدر پر ایک مضمون لکھا تھا۔ عنوان

ہے ۔" تجھے ہم ولی سمجھتے ۔ ۔ ۔ ۔"

ظفر گورکھ پوری کو گوڑ صاحب نے اردو غزل کا معتبر شاعر کہا ہے ۔ اور اس میں شک نہیں کہ ظفر کی غزلوں میں اس کی اپنی زندگی کا آہنگ ہے ۔

" نئے ہندوستان میں ظفر نے گورکھ پور کی دیہاتی فضا کو چھوڑ کر روٹی کی خاطر بمبئی کا رخ کیا اور بمبئی ان کے لیے اتنی ہی خیرہ کرنے والی ثابت ہوئی جتنا غالب کے لیے کلکتہ ثابت ہوا تھا ۔ پھر بمبئی صنعتوں، مشینوں کا شہر تھا ۔ یہاں انسان بھی مشین کا پرزہ بن گیا تھا، اب ظفر انسان نہیں اپنے آپ کو ملبہ محسوس کرنے لگے"۔

تو مرے جسم کا ملبہ کریگا کیا لے کر
کہ اپنی روح تو میں دے چکا مشینوں کو

اور پھر مشینوں سے ذرا فرصت ملی تو ؎
بے تحاشا میں ترے گھر کی طرف بھاگا ہوں ۔ ان مشینوں نے ذرا دیر جو چھٹی دی ہے

راج بہادر گوڑ کے مضمون کا یہ اقتباس ظفر گورکھ پوری کی زندگی اور فن کی جھلک پیش کرتا ہے ۔ اور مزید مطالعے کی دعوت دیتا ہے ۔

اجل کی قسط بھی دے کر چکا نہیں سکتی
جناب قرض بہت ہے حیات پر میرا
خود مرا زخم ہے یا تیرے بدن کا صندل
جانے کیا شب کو مہکتا ہے مرے کمرے میں

علی باقر زیدی کے مجموعہ کلام " شبِ درد" پر راج بہادر گوڑ نے قلم اٹھایا ہے ۔ اس کی زندگی کا اجمالی خاکہ بھی اس مضمون میں مل جاتا ہے کہ اس شاعر نے ٹریڈ یونین کے پرچم تلے زندگی بسر کرنا سیکھا ۔ ملازمتیں کیں اور چھوڑیں ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کیا ۔ اور شاعری بھی ۔ گوڑ صاحب نے علی باقر کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

" باقر نے شاعری کچھ دیر سے شروع کی ۔ زندگی کا سارا کرب وطرب، ہنگاموں کا تجربہ، سماج کی کشمکش، آزادی اور پھر وہ بھی داغ دار ۔ محنت کشوں کی بدحالی

اور خوش حالوں کی بدمستی، نظم ونسق کی معذوری اور عوام کی مجبوری ــــ سبھی کچھ
ان کے وسیع اور عمیق تجربے میں گھل مل گئے ہیں۔"

مختصر الفاظ میں یہ بھرپور تجزیہ ہے اور راج بہادر گوڑ کی مشاقی کی دلیل ہے ــــ باقر کی غزلوں میں پرانا پن ہے ؎

حال پوچھا تھا ذرا مونس و ہمدم کی طرح
رخِ بیمار پہ جینے کی ادا لوٹ آئی
راز دل تم سے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
تم نے ٹوٹا ہوا آئینہ بھی دیکھا ہوگا

غزل کی بہ نسبت باقر کی نظمیں زیادہ فکر انگیز ہیں۔ گوڑ صاحب نے لکھا ہے کہ "عورت خدا کی عدالت میں" باقر کی بہترین نظم ہے۔ لیکن اس کے جو اقتباسات دیے ہیں وہ عورت کی مظلومیت پر عام نظموں جیسے ہی ہیں۔ دوسری نظموں میں بھی راست انداز بیان ہے ــــ بہرحال ایک شاعر کا اضافہ ہوا۔

قمر جمالی حیدرآباد کی نئی افسانہ نگار ہے۔ اور اس نے نئی اور چونکا دینے والی کہانیاں لکھ کر حیدرآبادی افسانہ نگار خواتین کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ جن میں زینت ساجدہ، جیلانی بانو، واجدہ تبسم اور نجمہ نکہت جیسے نمایاں نام ہیں۔ گوڑ صاحب نے قمر جمالی کی زندگی کی جھلک پیش کی ہے۔ عسرت کی گود میں پلی ہوئی یہ لڑکی، درد کی انگلی پکڑے زندگی کے راستے پر ثابت قدمی سے چلتی ہوئی اور جدو جہد کے خارزار سے گزرتی ہوئی اب اس موڑ پر آئی ہے جہاں اس کا اپنا گھر ہے، شوہر ہے، بچے ہیں، ایک معقول ملازمت ہے۔ اور اس کا قلم کہانی کے لالہ زار میں نئے نئے پھول کھلا رہا ہے، اس کی کہانیوں میں اس کی زندگی ہزار زاویوں سے جھانکتی ہے۔ گوڑ صاحب نے قمر جمالی کے افسانوی مجموعے "شبیہ" پر لکھتے ہوئے اس کے کئی افسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ خود قمر کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے۔

"زندگی اس کا کل سرمایہ ہے اور وہ بھرپور زندگی گزارنے کی قائل ہے، وہ افلاس اور مجبوری کو دیکھ کر مضمحل ہو جاتی ہے۔"

اس ضمن میں انھوں نے قمر کی کہانی 'فاتح عالم' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

"قمر جمالی کے نزدیک درد انسان کی تکمیل کرتا ہے اور اس کے بغیر وہ مکمل نہیں ہوتا"

گوڑ صاحب نے مضمون کے آخر میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے ـــــ اور میرے نزدیک وہ بڑی شاعرانہ ہے۔

"قمر کی کہانیوں میں ایک بات اور جو قاری کے ذہن میں خلش پیدا کردے گی وہ قمر کا بارش سے لگاؤ ہے۔ روشنی میں قحط کے بعد خوشگوار بارش ہوتی ہے۔ "فاتح عالم" میں زبردست بارش ملتی ہے۔ "چنگاری" میں اسلم بارش میں منیدر کے گھر آتا ہے اسے لے جانے کے لیے ـــــ قمر کا بارش سے اس لگاؤ کا راز کیا ہے۔ کہانیوں سے اس کا پتہ چلانا مشکل ہے۔"

میرے خیال میں یہ قمر کے شاعرانہ مزاج کی دلیل ہے۔ بارش جلتی ہوئی زمین پر آسمان سے رحمت کی طرح برستی ہے۔ بارش میں بھیگنا ذہن کے الجھاؤ اور تناؤ کو یک لخت ختم کردیتا ہے۔ اور طبیعت میں روانی اور جولانی آجاتی ہے ـــــ بارش زندگی کی بنجر زمین میں نئی روح پھونکتی ہے، اس کی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔

عسرت اور تنگ دستی کی چٹختی ہوئی زمین پر سکون اور خوش حالی کی بارش ہو تو دل توانا اور احساسات شاداب ہوجاتے ہیں ـــــ قمر جمالی سے زیادہ بارش کی جادوئی کیفیت کو اور کون محسوس کرسکتا ہے۔ وہ "شبیہ" کی مقبولیت کے بعد "سبوچہ" بدست محفلِ ادب میں آئی ہیں، اور شہرت کی نئی بارشوں کو قمر کی تلاش ہے۔

حیدرآباد کے ایک پختہ عمر کے نثر نگار مجیب الرحمٰن۔ اپنے پہلے مجموعہ مضامین "ماورائے شعور" کے ساتھ اردو تنقید کے افق پر طلوع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو مجیب الرحمٰن کو بہت پہلے سے جانتے ہیں ـــــ اور اتنا جانتے ہیں کہ ان کے متعلق ضروری اطلاعات ایک عام قاری تک پہنچائی ہیں ـــــ ان کے مجموعہ مضامین کو کھنگالا ہے۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس طرف

اشارہ کیا ہے کہ مجیب الرحمٰن کے شعوری ارتقا میں کن عوامل کا حصہ ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ مجیب الرحمٰن کے ایک مضمون سے ہی اقتباس پیش کرتے ہیں جو دراصل گوڑ صاحب کے ذہن کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

"ادیب کی تخلیق کو سمجھنے کے لیے نقاد کو اس ماحول کو معلوم کرنا چاہیے جس سے مصنف کا خمیر اٹھا ہے۔ ان مضامین کی تہہ تک پہنچنے کے لیے سماجی رشتوں اور ان سے بڑھ کر ان آویزشوں کی تفہیم ضروری ہے جنھوں نے مصنف کی شخصیت کی تعمیر، اس کے ذہن کی تربیت اور اس کے شعور کی رفعتوں پر اثر ڈالا ہے۔"

مجیب الرحمٰن کی تحریر کا یہ ٹکڑا اس غیر معروف نقاد کو ان نام نہاد نقادوں کا حریف بنا دیتا ہے جو ہر تخلیقی فن پارے کو ایک ہی ترازو میں تولتے ہیں۔ دراصل اس میکانکی تنقیدی رویے نے ہی لفظ 'نقاد' کی ساکھ کو بگاڑ دیا ہے، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مجیب الرحمان کی کتاب پر اس انداز سے لکھا ہے کہ وہ اپنے ذہنی شعور کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

"آرٹ اور افواہ" کے حوالے سے گوڑ صاحب نے جو بات کمٹ منٹ کے بارے میں کہی ہے وہ آج کے دور میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

"بھیونڈی کانفرنس نے جس تنگ نظری کو ہوا دی اس سے ادب کو نقصان پہنچا اور انقلاب کو بھی کمٹ منٹ کے دائرے کو تنگ کر کے ادبی تخلیق پر پہرے بٹھا دیے اس کا منفی ردِ عمل تو وہ ہے جو ہر قسم کی آئیڈیالوجی سے نفرت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سے ادب نے اپنی جمالیاتی شناخت و ساخت کھو دی۔ — لیکن صحیح رویہ تو یہ ہے کہ عصری سماجی تقاضوں کے مطابق وسیع معنوں میں انسان دوستی کی قدروں سے وابستگی آج بھی تخلیق ادب کی روح ہے۔"

'ادبی تناظر' کے حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جو بنیادی طور پر ایک ٹریڈ یونینسٹ ہیں۔ اور اپنی تعلیم کے اعتبار سے ادویات کے ڈاکٹر — ان کا اردو سے شغف۔ اور اس درجہ شغف کہ وہ گاہے گاہے اردو میں مضامین لکھتے رہے اور ان کے مضامین کے مجموعے چھپتے رہے۔ اردو زبان کے لیے خوش آیند بات ہے۔ بہ قول

سردار جعفری "مردہ سرو اعظان کالج" ہی تنقید کو اپنی جاگیر کیوں بنائیں۔ تنقید کے لیے صرف تخلیق اور تخلیق کار سے ہی واقفیت ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے بھی واقفیت ضروری ہے جن کے لیے تخلیق کار لکھتا ہے۔ (چاہے وہ یہ بات مانے یا نہ مانے) تخلیق کا رشتہ تخلیق کار سے ہوتا ہی ہے۔ مگر وہ رشتہ بے معنی ہے اگر تخلیق کو عام قاری قبول نہ کرے۔ اسی لیے تنقید لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نقاد ادب کے قاری سے واقف ہو، عوام سے واقف ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ سماج آج کیا چاہتا ہے۔ اور انسانی برادری کے لیے آج کیسے ادب کی ضرورت ہے۔ اس نظریے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو تنقید کرنے اور تخلیق کار کی لغزشوں کی گرفت کرنے کا پورا حق ہے ۔۔۔۔ اس بکھراؤ کے دور میں زندگی کو ایک مرکز پر لانے کے لیے سماج کے مزاج شناسوں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور بلاشبہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سماج کے مزاج شناس ہیں۔

جواد رضوی

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: مجاہد آزادی ۔ محبِّ اردو

۲۱ جولائی ۱۹۹۳ء کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (۸۵) سال کے ہو گئے یعنی انھوں نے اپنی پلاٹینم جوبلی منائی۔ اور اس کو حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ تقریباً ایک مہینہ پہلے حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی جس کے راج بہادر بھی ایک مایہ ناز سپوت ہیں، کی پلاٹینم جوبلی تقاریب کا بھی آغاز ہوا۔ اس موقع پر اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ ہماری دوستی کی بھی گولڈن جوبلی پوری ہو گئی اس قافلے کے دو اور ساتھی ڈاکٹر حسینی شاہد اور سری نواس لاہوٹی تھے جو اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سات دہے کی ان کی زندگی میں پانچ دہے یعنی ان کی عمر کا دو تہائی حصہ تو ملک اور قوم کی خدمت کے نذر ہو گیا جس میں جیل کی زندگی کے تقریباً ڈیڑھ سال بھی شامل ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق کی بات ہے کہ راج بہادر اور میں ۲۹ نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک ساتھ گرفتار ہوئے اور پانچ مہینے سے کچھ زیادہ عرصہ تک حیدرآباد سنٹرل جیل میں نظر بند رہے اور ۷ مئی ۱۹۴۷ء کو ہم دونوں کو دواخانہ عثمانیہ لایا گیا جہاں سے ہم فرار ہو گئے اور تقریباً چار سال روپوش Under Ground رہنے کے بعد ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو دوبارہ گرفتار ہوتے جب وہ ہاتھ میں بندوق اٹھائے راج کنڈہ (ضلع نلگنڈہ) کی پہاڑیوں میں ہتھیار بند لڑائی Armed Struggle میں حصہ لینے کے ارادہ سے جا رہے تھے۔

۱۹۵۲ء میں جب وہ حیدرآباد سنٹرل جیل میں تھے تو ڈاکٹر رادھا کرشنن جو اس وقت نائب صدر جمہوریۂ ہند اور صدر نشین راجیہ سبھا تھے، کی موثر مداخلت کی بنا پر انھیں جیل سے فوری رہا کر دیا گیا اور انھوں نے راجیہ سبھا کی کرسی سنبھال لی۔ جس پر وہ دس سال تک براجمان رہے۔ میں سمجھتا ہوں

کہ یہ ان کی زندگی میں بہت اہم موڑ Turning Point تھا جس کے بعد وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلسل ترقی کے منازل طے کرتے رہے اور شاید ہی کبھی تنزلی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ دکھ درد کی کچھ گھڑیاں تو ہر ایک کی زندگی میں آتی رہتی ہیں۔

۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو۔ جب پہلی عالمی جنگ ختم ہو رہی تھی اور اس کی تباہ کاریوں کے بطن سے ایک نیا نظامِ حیات اور غیر طبقاتی سماج جنم لے رہا تھا۔ راج بہادر شہر حیدرآباد کے ایک قدیم اور پچھڑے ہوئے محلہ گوتی پورہ میں جنم لے رہے تھے۔ اور جب ہوش سنبھالا تو اسی سوشلسٹ سماج کے آدرشوں کو پروان چڑھانے ساری عمر جدوجہد کرتے رہے۔

رائے محبوب رائے اور شریمتی امراوتی گوڑ کے اس بڑے فرزند نے متوسط طبقہ کے ایک کائستھ گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دو دہوں میں مفید الانام، دھرونت ارفاہ عام اور شاہ علی بنڈہ کے مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول سے ۱۹۳۶ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے دو سال میں انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی اور جب دوسری عالمی جنگ شروع ہونے والی تھی تو میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور ستمبر ۴۳ ۱۹ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کرلی اور برائے نام ڈاکٹر تو کہلانے لگے لیکن نہ کبھی کسی مریض کی نبض دیکھی، نہ کوئی نسخہ لکھا اور نہ کبھی Stethescop کا استعمال کیا۔

آئیے اب ذرا ان کے حسب نسب پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ راج بہادر کا آبائی وطن کشن پور ہے جو گوسائی گنج تحصیل اور ضلع فیض آباد کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ امراؤ جان ادا کا وہی فیض آباد ہے جو حال ہی میں فرقہ واریت کے ایک شرمناک واقعہ کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ ان کے حقیقی دادا شری ہری پرشاد گوڑ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ انیسویں صدی کے چھٹے دہے میں یعنی ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت کے کچھ ہی برسوں بعد حیدرآباد آکر بس گئے۔ ایک اور بھائی کامتا پرشاد نے اپنا آبائی وطن نہیں چھوڑا۔ ان کی اولاد اب بھی وہیں سکونت پذیر ہے۔

ان کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ ان کی شخصیت میں ابتدا ہی سے دو نمایاں دھارے تقریباً ایک ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک ادبی اور دوسرا سیاسی۔ اسکول کے زمانہ میں وہ اردو کے استاد صدیق جائسی سے متاثر ہوئے اور ان ہی کی بدولت راج میں

شعر و شاعری سے دلچسپی اور سخن فہمی کے شعور کی ابتدا ہوئی۔ پھر انھوں نے نیاز فتح پوری کا "نگار" پابندی سے پڑھنا شروع کیا جس کی وجہ سے ان میں حقیقت پسندی اور ترقی پسند خیالات پرورش پانا شروع ہوئے۔ اسی زمانے میں ایم۔ این۔ رائے کی انقلابی تحریروں، اشوک مہتا کے رسالہ "کانگریس سوشلسٹ" اور الہ آباد سوشلسٹ بک کلب کی جانب سے شائع کی جانے والی کتابوں کے گہرے مطالعے نے ان میں سوشلسٹ اور مارکسسٹ خیالات کی تخم ریزی کی۔ ایک اور واقعہ ان کے سیاسی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق غالباً ۱۹۳۸ء میں انھوں نے گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد پر مضمون لکھا جس میں اس فلسفے کی کامیابی پر اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ قاضی عبدالغفار صاحب مدیر روزنامہ "پیام" نے یہ مضمون "کس طرح اور کیوں کر" کے زیرِعنوان اپنے اخبار میں شائع کیا جس سے ان کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ ان کے ادبی ذوق کو بڑھاوا دینے اور جلا پیدا کرنے میں ان کے چچا محبوب نارائن گوڑ کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔

جب وہ میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھے تو ۱۹۴۱ء میں وہ نہ صرف کالج یونین کے نائب صدر چنے گئے بلکہ کالج میگزین کے اڈیٹر بھی بنائے گئے۔ اسی بتدریج ابھرتے ہوئے ادبی ذوق نے ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب کو بیدار کر دیا اور اب تو ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل تین جلدیں ۔ "ادبی مطالعے"، "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی انھوں نے اس دور کے سیاسی حالات اور مسائل پر کئی پمفلٹ لکھے جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں "حیدرآباد پر ترنگا جھنڈا لہرائے گا"۔ Tricolour shall fly over Hyderabad. مخدوم اور تلنگانہ کی انقلابی تحریک کے بارے میں ایک طویل اور مبسوط مضمون لکھا جو دوسرے مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ لکھنے، پڑھنے اور کتابوں سے ان کی گہری دلچسپی کا اظہار اس ریڈنگ روم سے بھی ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ۱۹۴۴ء میں اپنے گھر پر شروع کیا تھا اور یہی دلچسپی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ اور آج سینکڑوں اردو اور انگریزی کتابوں اور رسائل پر مشتمل ایک اچھی خاصی لائبریری ان کے گھر کی رونق بنی ہوئی ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آخری پانچ، چھ سال ریاست حیدرآباد میں سیاسی اور سماجی ہل چل کا زمانہ رہا ہے۔ آریہ سماج، گنیش اُتسو، اسٹیٹ کانگریس اور وندے ماترم تحریکات

ابھر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ راج بہادر جیسا حساس نوجوان ان تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی اور ۱۹۴۰ء میں کامریڈز ایسوسی ایشن میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ایک سرگرم اور اہم لیڈر بن گئے۔ لگ بھگ ان ہی دنوں مخدوم، عالم خوندمیری، غلام حیدر، میں اور کئی دوسرے ساتھی بھی ان تحریکوں سے وابستہ ہو گئے۔ تقریباً اسی زمانہ میں مزدور تحریک کی جانب ان کا جھکاؤ بڑھنے لگا اور کچھ ہی عرصہ میں وہ ریاست حیدرآباد کی مختلف ٹریڈ یونینوں سے وابستہ ہو گئے۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں حیدرآباد میں جتنی بھی جمہوری اور ترقی پسند تحریکوں اور تنظیموں نے جنم لیا ان کا راج بہادر سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رہا اور بعض تنظیموں کی بنیاد رکھنے والوں یا پھر ان میں کلیدی رول ادا کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

راج بہادر کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک مشہور کمیونسٹ رہنما ہیں، چوٹی کے ٹریڈ یونین لیڈر ہیں، اردو کے ایک جانے مانے انشاپرداز ہیں، مجاہد آزادی اور مجاہد اردو بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی ان مجاہدانہ خدمات کے اعتراف کے طور پر حال ہی میں انھیں دلی اردو اکیڈمی کی جانب سے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے علاوہ بہار اردو اکادمی اور آندھرا پردیش اردو اکادمی نے بھی دو ایوارڈوں سے انھیں نوازا ہے۔ لیکن میرے اس مضمون کا مقصد راج بہادر کی ان تمام مجاہدانہ سرگرمیوں کا جائزہ لینا نہیں ہے اور نہ میرے لیے یہ ممکن ہے کیوں کہ اب میرا تعلق نہ عملی سیاست سے رہا، نہ ٹریڈ یونین تحریک سے اور نہ اردو ادب سے۔ یہ سب میدان چھوڑے (۳۵) برسوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اب میں صرف مجاہد آزادی ہوں، اردو ادب اور زبان سے گہری دلچسپی رکھتا ہوں۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا ایک حقیر کارکن ہوں، کبھی کبھار چند مضامین لکھ کر اپنی ادبی اور سیاسی تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ راج بہادر کا (۵۰) سال سے زیادہ عرصہ سے بلافصل دوست رہا ہوں اور کوئی (۳۷) برس سے ان کا ہم محلہ بھی ہوں۔ اس لیے انھیں بہت قریب سے دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کا خوب موقع ملا ہے۔ اپنے دیرینہ مشاہدوں کی بنا پر ان کی نجی زندگی اور شخصیت کے روشن اور غیر روشن پہلوؤں کا صرف دوستانہ نہیں بلکہ ناقدانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

اب تو کسی کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ راج بہادر ایک دانشور ہیں اور میرے خیال میں ان کے دانشور بننے میں دو عوامل زیادہ کارفرما رہے ہیں، ایک تو ان کی غیر معمولی یادداشت اور حافظہ اور دوسرے کئی برسوں سے ان کا وسیع مطالعہ اور اس مطالعہ سے پورا استفادہ حاصل کرنے ان کی انتھک محنت اور جستجو۔ انھیں سیاسی اور ٹریڈ یونین مسائل سے اردو ادب کے مختلف موضوعات اور اردو زبان کی نشو و نما، ترقی اور تحفظ سے نہ صرف گہری دلچسپی ہے بلکہ ان تحریکوں سے والہانہ وابستگی ہے۔ اس لیے وہ ان مختلف النوع مسائل پر انگریزی اور اردو میں مسلسل مضامین، تبصرے اور خاکے لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر ان کے بیانات اور تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دماغ ایک چھوٹا سا دیسی کمپیوٹر ہے جس کے مختلف خانوں میں سیاست، ٹریڈ یونین، اردو ادب و زبان کے مختلف مسائل کو Feed کر دیا گیا ہو اور حسب ضرورت اس کمپیوٹر کے سیاسی بٹن کو دبایا جائے تو حالات حاضرہ پر ایک موزوں اور مفید مضمون یا بیان تیار ہو جائے گا، یا پھر ٹریڈ یونین بٹن پر انگلی رکھی جائے تو مزدوروں اور ان کی یونینوں کے مسائل پر یادداشتیں اور میمورنڈم کی کاپیاں آپ کو مل جائیں گی، اردو زبان کے بٹن پر ہاتھ رکھا جائے تو ادبی مضامین اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اس کمپیوٹر میں متفرقات کا بھی ایک خانہ ہے جس میں مذہبی، سماجی اور تہذیبی موضوعات اور معاشی مسائل پر ضروری مواد Feed کیا ہوا تیار ملے گا۔ جو خواہش مند ہوں انھیں حسب ضرورت معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راج بڑے زود نویس واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ ان تمام موضوعات پر جس سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ چل رے خامہ بسم اللہ کا نعرہ لگا میز پر بیٹھ جائیں گے اور بہت کم وقت میں مطلوبہ مضامین، تبصرے، بیان اور قرارداد آپ کے ہاتھ میں تھما دیں گے۔

راج بہادر بڑے شاہ خرچ انسان ہیں۔ اگر انھیں کسی صبح اچھی خاصی رقم مل جائے تو رات ہونے تک ان کا ہاتھ خالی نظر آئے گا۔ وہ صحیح معنوں میں پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ہاتھ کی اس گندگی سے جتنا جلد ہو سکے چھٹکارہ مل جائے۔ جب وہ

کسی مارکٹ میں سبزیاں اور گوشت وغیرہ خریدنے جاتے ہیں تو ہر سبزی فروخت کرنے والی اور دکان دار یہ آواز دے گا کہ "صاب" ہمارے پاس آؤ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ شخص جو بھی مال خریدے گا اس کے بھاؤ نہیں چکائے گا۔ تول میں ڈنڈی مارنے پر کبھی نظر نہیں رکھے گا۔ مطلوبہ اشیا کا اچھا خاصا آڈر دینے کے بعد صرف یہ پوچھے گا کہ کتنے پیسے ہوئے اور جلد رقم سے کچھ زیادہ پیسے دے کر چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ جب کبھی وہ آٹو یا سائیکل رکشا میں بیٹھیں گے تو رکشا والے سے صرف یہی کہیں گے کہ بھئی فلاں مقام کو جانا ہے اور رکشا میں بیٹھ جائیں گے کرایہ کے تعلق سے، رکشا والے کے پوچھنے کے باوجود کوئی بات نہیں کریں گے اور منزل پر پہنچنے کے بعد اس سے دریافت کریں گے کہ کتنا کرایہ ہوا، وہ جو کچھ بھی کہے گا اس سے زیادہ ہی دے دیں گے۔

راج بہادر بڑے مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ حیدرآباد میں کسی ادبی، تہذیبی اور سیاسی تقریب اور جلسے کے سلسلہ میں جب کوئی ادیب، شاعر اور سیاسی قائد آئے تو اس کی ایک شام راج بہادر کے گھر پر ضرور گزرے گی جہاں وہ پورے لوازمات کے ساتھ دعوت کا اہتمام کریں گے اور وہ بھی دعوت تر۔ چاہے انھیں ان دعوتوں کے اہتمام کے لیے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ان دعوتوں میں مجھے جن دانشوروں اور ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔ فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطان پوری، قمر رئیس، کیفی اعظمی، ظفر الحسن، سی نارائن ریڈی، آئی۔ کے۔ گجرال، پی۔ شیوشنکر، منتھو، فلمی اداکار ہنگل۔ ان شخصی دعوتوں کے علاوہ ان کے گھر پر عزیز احمد خاں وارثیؒ کی قوالی، وٹھل راؤ اور ان کے ساتھیوں کی محفل نغمہ کی کئی بیٹھکیں منعقد کی جاتی رہی ہیں۔

راج بہادر بہت مصروف آدمی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی روزمرہ زندگی میں ایک نظم و ضبط باقاعدگی اور نفاست پسندی کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ سیکڑوں کتابوں اور رسالوں کی ان کی لائبریری بڑی حد تک منظم کہی جاسکتی ہے۔ وہ جن اداروں اور تنظیموں میں کام کرتے ہیں ان کی درجنوں فائلیں اور کاغذات بڑی باقاعدگی سے محفوظ ہیں۔ ان کے مضامین، تبصرے اور بیانات وغیرہ جو مختلف رسائل اور اخباروں میں شائع ہوتے ہیں ان کے تراشے بڑی جتن سے فائل

کیے ہوئے ہیں۔ مختلف رسائل میں شائع ہونے والے اہم اور کارآمد مضامین کی زیراکس کاپیوں کا بھی ان کے یہاں بڑا ذخیرہ ہے۔

شاید بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ راج بہادر بہت اچھے باورچی بھی ہیں اور یہ فن انھیں اپنے دادا سے ورثے میں ملا۔ وہ کوئی باقاعدہ اور تربیت یافتہ باورچی نہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر بریانی، ہر قسم کے سالن، اچار اور میٹھا وغیرہ تیار کر لیتے ہیں۔ ان کے پکوان کا ایک دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔ غالباً ۴۵۔۱۹۴۶ء کا زمانہ ہوگا۔ راج، مخدوم، مرزا حیدر حسین اور دوسرے کامریڈ گھانس منڈی (سکندرآباد) کے پارٹی آفس میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن مخدوم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں بریانی اور میٹھا کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اس زمانہ میں پارٹی کی خستہ حالی حالت کے پیش نظر مخدوم کی اس خواہش کو اس دور کے پورے لوازمات اور اہتمام کے ساتھ پورا کرنا ناممکن تھا۔ راج بہادر نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ تھوڑا "بڑا گوشت" کسی طرح خرید لے آئے اور "گُدّی" بریانی کا بندوبست کر دیا۔ اب سوال تھا میٹھے کا۔ ان دنوں راشن کا موٹا اور لال رنگ کا چاول ملتا تھا۔ جس کی پیچ گاڑھی اور سرخ نکلتی تھی، راج نے اس گاڑھی پیچ میں شکر ملا کر خوب ٹھنڈا کیا اور جب وہ قدرے سخت ہو کر جم گئی تو کاجو کاٹ کر اس کے اوپر پھیلا دیے اور اس طرح میٹھا بھی تیار ہو گیا۔

اب کچھ سخن گسترانہ باتیں! لیکن مشکل یہ ہے کہ مشرقی تہذیب کی یہ قدیم روایات رہی ہیں کہ کسی شخص کی کھلم کھلا عیب جوئی نہ کی جائے اور دوسری طرف جدید سوانح اور خاکہ نگاروں کا یہ نظریہ ہے کہ کسی شخصیت کا بھرپور اور مکمل جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی نہ صرف اچھائیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا جائے بلکہ اس کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔ آیئے اس جدید نقطۂ نظر سے راج بہادر کی شخصیت کے کچھ غیر روشن پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔ راج بہادر بڑے چلبلے، اور کبھی نچلا نہ بیٹھنے والے آدمی ہیں۔ اگر آپ کسی سنجیدہ محفل یا اہم جلسہ میں بیٹھے ہوئے ہوں اور راج بہادر وہاں قدم رنجہ فرمائیں تو آپ فوراً محسوس کریں گے کہ ان کی آمد نے محفل کا رنگ ہی بدل دیا وہ اپنی بلند آواز میں مزاحیہ جملوں، دل لگی، مذاق (برمحل اور بے محل) اور چھیڑ چھاڑ سے محفل کی خاموشی اور سنجیدگی کو ختم کر دیں گے۔ ان کے بعض احباب کا خیال ہے کہ وہ مذاق کی رَو میں

بھی حد آداب سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ جب کسی تنظیم کی کاروباری میٹنگوں میں شریک ہوتے ہیں تو ایجنڈے کے تمام مسائل پر مسلسل اپنے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ نتیجتاً دوسرے شرکائے میٹنگ کو اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ انھیں دوسروں کی باتیں سننے کی عادت کم اور اپنی ہی باتیں سنانے کی عادت زیادہ ہے۔ خود انھوں نے اپنی اسی خصوصیت کے بارے میں کہا ہے۔

کہنے پہ جب آتا ہے تو پھر بس نہیں کرتا
میٹنگ میں کبھی گوڑ کسی کی نہیں سنتا

راج بہادر گوڑ کی زندگی کے دو جزو ایمان ہیں ایک تو کمیونسٹ پارٹی اور دوسرے ٹریڈ یونین تحریک۔ وہ پارٹی کے انتہائی وفادار اور ڈسپلن کے پابند سپاہی ہیں۔ پارٹی کے ہر اعلان کردہ پالیسیوں اور پروگراموں کو چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط ــــ من وعن اور یقین محکم و عمل پیہم سے پورا کرنے کے قائل ہیں۔ وہ پارٹی پر کسی قسم کی اور کسی جانب سے موجودہ بدلے ہوئے حالات میں بھی تنقید کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے اور جذباتی انداز میں برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پرولتاریہ طبقہ کو وہ اپنی رگ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس جذباتی لگاؤ کی بنا پر ان کی دانست میں مزدور اور ان کی ٹریڈ یونین کسی لغزش یا غلطی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔ اگر بدقسمتی اور اتفاق سے ایسی کوئی بات ہو بھی جائے تو وہ اس کی بالکلیہ ذمہ داری انتظامیہ Management اور بیوروکریسی کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

بعض صاحبان علم و حکمت کا یہ بھی خیال ہے کہ دانشوروں میں عام طور پر کچھ نہ کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ جیسے لاابالی پن، مئے نوشی، عشق و محبت کی داستانوں سے ان کی وابستگی وغیرہ، وغیرہ۔ اگر اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر راج بہادر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے ؟

راج بہادر اپنی (۵۵) سالہ کامیاب عوامی زندگی میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس، انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے

پونٹ کے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور ان ہی تنظیموں کے نمایندہ کی حیثیت سے انھیں ایشیا، یورپ، انگلستان اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک کا سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔

شہرت اور ترقی کے ان منازل کو طے کرنے کے باوجود گھمنڈ اور غرور جیسی برائیاں ابھی تک ان کی زندگی کا حصہ نہیں بنی ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادے اور منکسرالمزاج آدمی ہیں۔ ان کا مکان ایک دربار کا منظر پیش کرتا ہے۔ جہاں مزدور، مختلف محکموں اور بنکوں کے ملازمین ادبی اور تہذیبی انجمنوں کے کارکن، ان کے دوست احباب اور غرض مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بہرحال موجودہ حالات میں ان کی شخصیت بہت غنیمت ہے۔ اور آخر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ:

"تم سلامت رہو ہزار برس"

ایم. حبیب خاں

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ــــ اردو کی ایک فعال شخصیت

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کے مشہور سیاست داں ہیں۔ انھوں نے عوام کے مسائل پارلیمنٹ میں نہایت موثر انداز میں پیش کیے۔ چوں کہ ان کا رویہ ہمیشہ تعمیری رہا ہے اس سبب کامیاب بھی رہے۔ ان کی شخصیت میں کئی خوبیاں یکجا نظر آتی ہیں یعنی انتہائی کشادہ ذہن اور غیر معمولی سیکولر انسان ہیں۔ ان تمام خوبیوں سے بالاتر ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور کچھ عرصے بعد ان کے ساتھ ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ذرا بھی چھوٹے بڑے کا فرق محسوس نہیں ہونے دیتے۔ طبیعت میں خوش مزاجی، نرمی، شگفتگی اور بذلہ سنجی ان کی شخصیت کے اہم جزو ہیں۔

گوڑ صاحب کا آبائی وطن اتر پردیش میں کشن پور چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جو ضلع فیض آباد کی تحصیل گوسائی گنج میں واقع ہے۔ یہ مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" کا وہی فیض آباد ہے جہاں ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء میں فرقہ واریت کا ایک شرمناک واقعہ وجود میں آیا تھا۔ ان کے حقیقی دادا ہری پرشاد گوڑ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ حیدرآباد میں آکر گولی پورہ میں آباد ہوگئے۔ تب سے ان کا خاندان حیدرآباد میں آباد ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گوڑ صاحب کی ادب سے دل چسپی سیاست کے بعد پیدا ہوئی۔ ان کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادب سے دل چسپی طالب علمی کے زمانے ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔ ابتدا میں وہ اردو کے استاد اور شاعر صدق جائسی سے بہت متاثر تھے۔ اور ان ہی کی بدولت گوڑ صاحب میں شعر و شاعری سے دل چسپی اور سخن فہمی میں شعور

پیدا ہوا۔ "نگار" اور بعض دوسرے معیاری رسالوں کی رہنمائی بھی ان کو حاصل رہی اور ان ہی کے مطالعے سے ان کی زندگی دو دھاروں میں بٹ گئی۔ ایک سیاسی اور دوسرا ادبی۔ اُردو ادب کا غائر مطالعہ کیا اور قدیم وجدید ادب سے واقفیت حاصل کی۔
ان کی ابتدائی زندگی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گزری۔ ۱۹۳۶ء میں چادرگھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد سے میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اسی زمانے سے وہ انگریزوں کے ظلم وستم اور بے انصافیوں کے خلاف لڑتے رہے۔ پولیس ان کو پکڑنے میں لگی رہتی مگر یہ پولیس کو چکمے دیتے رہتے۔ تقریریں کرتے اور فرار ہو جاتے۔ خدا جانے فرار ہونے کی ٹریننگ حیدرآباد کے کس اسکول میں لی تھی۔ البتہ ایک دوبار فرار ہونے میں ناکامی ہوئی، گرفتار ہوئے اور جیل بھیج دیے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں جب وہ زیرِتعلیم تھے تو کامریڈز ایسوسی ایشن کی تشکیل ہوئی اور جب کے وہ اہم اور فعال رکن تھے۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں معتمد عمومی اور صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں آزاد ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن جو صدر راجیہ سبھا بھی تھے۔ ان کی مداخلت سے گوڑ صاحب جیل سے رہا کر دیے گئے اور وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنا دیے گئے۔ گوڑ صاحب راجیہ سبھا کے ممبر دس سال یعنی ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک رہے۔
مخدوم محی الدین، نیاز حیدر اور جواد رضوی کی دوستی اور صحبت سے انھیں مطالعے کے شوق کو جلا ملی۔ کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت اُردو والوں میں کم ہوتی ہے لیکن گوڑ صاحب ہمیشہ کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کتب بینی کی یہ عادت ابھی تک جاری ہے۔ ان کے تین تنقیدی مضامین کے مجموعے یکے بعد دیگرے "ادبی مطالعے، ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں "حسرت کی غزل گوئی"، "فراق گورکھپوری"، "مخدوم کی زندگی اور شعر"، "کیفی اعظمی ۔ سارے جہاں کا غم"، "جیلانی بانو کی کہانیاں"، "روشنائی ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی"، "غالب اور جدید ذہن"، "سروجنی نائیڈو کی ہمہ گیر شخصیت"، "آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت"، "خواجہ احمد عباس"، "راجندر سنگھ بیدی ایک عظیم فن کار"، "جلیل مانک پوری عہد اور کلام"، "نیاز حیدر زندہ ہے"،

اور "ایک گھر جو تقسیم ہو گیا"۔ بڑے اہم مضامین ہیں جن میں علمی بصیرت اور گہری نظر کا اظہار ملتا ہے۔ ان مضامین میں شخصیت اور فن پر ان کی بے لاگ رائے ان کی گہری سوچ اور علمیت کا پتا دیتی ہے۔ "ایک گھر جو تقسیم ہو گیا" A House Devided امرت رائے کی انگریزی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں :

"اس طویل تبصرے کو ختم کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ امرت رائے کا مطالعہ معلومات آفریں تو ہے لیکن مکمل نہیں اور جو نتائج انھوں نے اخذ کیے ہیں وہ ہماری زبانوں کی ارتقا کی تاریخ اور عصری ہندوستان اور اس کے ابھرتے ہوئے لسانی نقشے سے متصادم ہیں[1]"

اس کتاب کے مطالعے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امرت رائے جو اردو کے سخت مخالفین میں سے ایک ہیں جگہ جگہ اردو تحقیق اور اردو کی رفتار اور اس کو ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں یقین نہیں آتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ امرت رائے نے اس کتاب کے لکھنے میں کسی اردو کے محقق اور ناقد سے مدد لی ہو اور اس کو اپنا شریک کار بنایا ہو۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انتہائی سیکولر انسان ہیں۔ انھوں نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"عبدالحق ایک غیر سیاسی انسان تھے اور اردو سے انھیں مجنونانہ عقیدت تھی۔ وہ اردو کی قدیم کتابوں کی تحقیق و تدوین کے بانیوں میں سے تھے۔ اردو زبان کی تعمیر میں صوفیوں کے رول پر عالمانہ مقالہ لکھا۔ انھیں بہت صدمہ تھا کہ پاکستان میں اردو کے ساتھ برا سلوک کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے تو اردو کو اس کے ہندوستانی روپ میں متحدہ ہندوستان کی رابطے کی زبان بنانے کے خواب بھی دیکھے تھے۔ اردو کو فرقہ پرست سیاست دانوں نے فرقہ وارانہ عصبیت کے پھیلانے کا ہتھیار بنایا۔ نظریۂ پاکستان کا پرچار ہندوستان کی سبھی زبانوں اور خاص طور پر انگریزی میں بہت ہوا ہے[2]"

یہ اس سیکولر انسان کے الفاظ ہیں جس نے حیدر آباد میں مولوی عبدالحق کی اردو خدمات

---

[1] و [2] ادبی تناظر۔ ص ۱۷۸۔

کے آتار چڑھاؤ اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ پاکستان کی تقسیم اگر اردو کی بنیاد پر ہوتی تو اردو پاکستان کی قومی زبان ہوتی اور وہاں اُردو کا وہ حال نہ ہوتا جس کی طرف گوڑصاحب نے اشارہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق زندگی بھر اُردو کو قومی زبان کا درجہ دلانے کے لیے کوشاں رہے لیکن ناکام رہے۔

گوڑ صاحب کی تحریر نہایت دلکش اور اثر آفریں ہے۔ اپنے دلائل نہایت استدلال، منطق اور سشیہ پن انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مزاح ان کی شخصیت کا خاص جز ہے۔ بات بات میں جملے بازی ان کی گفتگو کو موثر بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مجلسِ عام کے ممبر ۱۹۶۱ء سے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب انجمن کا دفتر دلی منتقل ہوگیا اس کے بعد وہ دو بار اس کے نائب صدر بھی رہے۔ ان کی دلآویز شخصیت کو دیکھنے کا موقع مجھے پہلی بار انجمن کی چوتھی آل انڈیا اُردو کانفرنس کے موقع پر جے پور میں ملا۔ یہ کانفرنس ۲، ۳ اور ۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو جے پور کے مسلم مسافر خانے کے وسیع میدان میں ہوئی تھی۔ اس کا افتتاح موہن لال سکھاڈیا نے کیا تھا جو اس وقت راجستھان کے چیف منسٹر تھے اور صدارت پنڈت آنند نرائن ملاّ نے کی تھی۔

گوڑ صاحب کو اُردو کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے میں نے پہلی بار جے پور کی کانفرنس میں دیکھا۔ گرج دار آواز، سفید شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ ان کے گٹھے ہوئے جسم پر اچھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں خاص قسم کی کشش اور شگفتہ انداز بیان نے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس تقریر سے پہلے مجھے ان کا وہ صدارتی خطبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انھوں نے ۳، دسمبر ۱۹۶۰ء کو بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کانفرنس مظفر پور کے موقع پر دیا تھا۔ اس خطبے میں انھوں نے اُردو زبان اور اس کے فروغ کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ وہ خطبے میں اُردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

" اُردو بہرحال ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیادیں یہیں ہیں اس کا لوک اَدھار یہیں ہے۔ اس کے بولنے والے یہیں رہتے بستے ہیں اور

وہ ان کی مادری زبان ہے۔ اس لیے انجمن ترقی اُردو (ہند) اور ہندوستان بھر میں اردو بولنے والوں کو یو۔پی اور بہار میں اردو کے موقف اور مستقبل کے بارے میں گہری تشویش لاحق ہے"۔

"اُردو کو آزاد ہندوستان کے آئین میں ایک قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن خود اس کے اپنے علاقے میں جو جائز مقام ملنا چاہیے ابھی تک نہیں ملا۔ اس مقام پر بہار باسی شاید خوش قسمت ہیں۔ اصل دقتوں کا سامنا تو اتر پردیش میں کرنا ہے۔ بہار اور یو۔پی کے حالات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ یو۔پی میں اردو کی جان بوجھ کر اور فرقہ وارانہ زاویوں سے مخالفت کی جاتی ہے اور ہندی بھاشائیوں کو اُردو بولنے کے خلاف صف آرا کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ریاست بہار میں اُردو بولنے والوں اور ہندی بولنے والوں کے درمیان صحت مند اور بھائی چارہ کے روابط ہیں۔ یہاں بہت سے ہندی پریمی اُردو کی اہمیت اور حیثیت کو مانتے ہیں"۔[۱]

گوڑ صاحب کا اُردو سے یہ جذبہ ان کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اُردو سے کس قدر محبت ہے۔

مئی ۱۹۷۴ء میں مجھے گوڑ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب انجمن کا دفتر علی گڑھ سے دلی منتقل ہو چکا تھا۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا دفتر اس وقت اجے بھون میں تھا اور گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ انجمن کا دفتر اجے بھون سے بہت قریب ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا ہفت روزہ آرگن "حیات" یہیں سے نکلتا تھا۔ یہیں ڈاکٹر اجمل اجملی مرحوم اور بشیر احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حیدرآباد سے جب کسی کام سے دلی تشریف لاتے ہیں تو ان کا قیام اجے بھون ہی میں رہتا ہے اور انجمن کا دفتر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ اور ان کی باغ و بہار گفتگو سننے کے اکثر مواقع ملتے رہتے ہیں۔

اُردو کی بحالی اور اس کو جائز حق دلانے کے لیے گوڑ صاحب ہمیشہ کوشاں رہتے

---

[۱] ادبی جائزے ص ۱۴۷

ہیں۔ جنتا دل حکومت کے زمانے میں علی سردار جعفری صاحب کی صدارت میں ۱۶ رکنی کمیٹی ۱۵ ر فروری ۱۹۹۰ء کو تشکیل دی گئی۔ پروفیسر نامور سنگھ اس کے نائب صدر تھے اور وزارتِ تعلیم کے مشیر جناب کے۔ کے۔ کھلر اس کے رکن معتمد بنائے گئے تھے۔ یہ کمیٹی گجرال کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ لینے کے لیے حکومت نے بنائی تھی۔ کمیٹی نے مختلف ریاستوں میں اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ذیلی کمیٹیاں بنائیں۔ مثلاً گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا پردیش کے لیے جو سب کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اس کے کنوینر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بنائے گئے۔ گوڑ صاحب نے اردو کے سلسلے میں جو نا بڑ توڑ کام انجام دیے وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کا اعتراف کیا جائے۔ جعفری کمیٹی نے ۱۱ ریاستوں کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ ۸ ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو حکومت کو پیش کردی۔ یہ رپورٹ ۲۵ ر جولائی ۱۹۹۱ء کو راجیہ سبھا میں اور ۲۹ ر جولائی کو لوک سبھا میں پیش کردی گئی۔ اس کمیٹی کے فعال ممبر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر خلیق انجم، کنور مہندر سنگھ بیدی، امرتیا پریتم اور جناب رام لعل وغیرہ تھے۔ جعفری کمیٹی وی۔ پی سنگھ سابق وزیر اعظم کی حکومت (جنتا دل) کے دور حکومت میں تشکیل دی گئی تھی۔ اس کے بعد ابھی تک اس کمیٹی کے بارے میں حکومتِ ہند کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ چاہے ہندوستان کا اتر پردیش کا صوبہ ہو یا جنوبی ہند کی ریاستیں اردو کے مسائل کو حل کرنے میں گوڑ صاحب کوشاں رہتے ہیں اور زبان کی صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کی شاخوں کی تنظیم بھی آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ انجمن کے دو بار نائب صدر رہے اور آج کل حیاتی ممبر ہیں۔ غرض اردو سے بے پناہ محبت ہونے کی وجہ سے اردو کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ گوڑ صاحب نے اردو کی گذشتہ ۴۰ سال کی رفتار اور ترقی کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اعتراف کئی بار مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کے جلسوں میں کیا ہے اور اب یہ بات دل کو لگتی ہے کہ حکومت کی نیت اردو کے معاملے میں کتنی ہی صاف ہو اور ارادہ کتنا ہی پختہ ہو، عوام کو چاہیے کہ اب اردو کا حل خود تلاش کریں، حکومت پر تکیہ نہ کریں۔ اس احتساب میں جتنی دیر لگے گی اردو کے لیے مزید مشکلات پیدا

ہو سکتی ہیں۔ اُردو کی جڑیں ابھی اتنی کمزور نہیں ہیں اور پیڑ کے پتوں میں ابھی ہریالی موجود ہے۔ لیکن اگر عوام اب بھی مل کر اُردو کی تہذیب کو نہ بچا سکے اور اُردو کے لیے کام نہیں کیا تو عین ممکن ہے کہ پیڑ کے پتے سوکھنے شروع ہو جائیں اور اُردو زبان کی حیثیت کلاسیکی بن کر رہ جائے۔ گوڑ صاحب حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی شناخت ہیں۔ انھوں نے مرکزی انجمن ترقی اُردو کی طرف سے جنوبی ہند کے دورے کیے اور عوام کو بیدار کیا کہ وہ اُردو کا حل خود تلاش کریں۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اور اُردو تعلیم کو گھر گھر پہنچانے میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اُردو تحریک کو متحرک بنائیں میر کا یہ شعر گوڑ صاحب کے کاموں کی یاد تازہ کرتا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

منوہر راج سکسینہ

راج بہادر گوڑ کی پچہترویں سالگرہ

(سوانحی خاکہ)

راج بہادر گوڑ جو آج ایک عظیم سیاسی رہنما ٹریڈ یونین لیڈر اور ایک معیاری ادیب و نقاد ہیں۔ گھر والے انھیں لاڈ پیار سے راجن پکارتے ہیں دوست احباب صرف راج سے مخاطب کرتے ہیں اور میں بھی اس مضمون میں انھیں راج ہی سے مخاطب کررہا ہوں۔

وہ عمر میں مجھ سے پانچ یا چھ سال بڑے ہیں مگر رشتہ میں وہ میرے بھانجے اور میں اُن کا ماموں ہوتا ہوں۔ عمر کی بزرگی اور رشتہ میں تعاون برقرار رکھنے کی خاطر ہم نے یہ سمجھوتہ کرلیا کہ وہ میرے بھانجے اور میں ان کا مانوں یار۔

راج سے میری رشتہ داری کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ راج کی حقیقی والدہ کا انتقال راج کی کمسنی میں ہوگیا اور راج کے والد جناب محبوب رائے صاحب گوڑ نے میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ سے بیاہ کیا۔ یہ کوئی لگ بھگ ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد جب راج شاہ علی بنڈہ وسطانیہ اسکول میں پڑھ رہے تھے مجھے بھی اسی اسکول میں شریک کیا گیا اس طرح اسکول آتے جاتے میرا ان کا سلام علیک ہوجایا کرتا تھا۔ میری کمسنی کے باعث اور میری جائیداد اور معاش کی حفاظت و صیانت کی خاطر راج کے والد محبوب رائے صاحب گوڑ میرے ہی ہاں ٹھہر کر میری سرپرستی فرماتے رہے ہیں اور آج بھی جب کہ وہ (۹۷) برس کے ہوچکے ہیں اُن کا سایۂ بزرگی قائم ہے۔ میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ کے بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ جو راج کی بھائی بہنیں ہیں۔

راج ایک ذہین طالب علم رہے ہیں ہمیشہ امتحانات درجہ اوّل و دوم ہی میں پاس کرتے رہے ان کی اس کامیابی کے باعث انھیں اعلیٰ جماعتوں میں داخلہ نہ صرف آسانی سے مل جاتا بلکہ تعلیمی وظیفہ

بھی ملا کرتا تھا۔ راج کو ان کی طالب علمانہ زندگی میں ایک اچھا تعلیمی ماحول ملا۔ رائے محبوب نارائن صاحب جو راج کے چچا تھے۔ ایک اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے انسان تھے اور وہ سماجی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے جس کے باعث راج میں کتب بینی اور مطالعہ کا ذوق بڑھتا گیا۔ راج کے چچا محبوب نارائن صاحب نے طلباء کے لیے دودھ مل گوڑہ میں ایک ہاسٹل قائم کیا جہاں راج بھی رہا کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ اپنے چچا محبوب نارائن کے گھر گولی پورہ میں رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راج ہمارے گھر واقع لال دروازہ اپنے والد جناب محبوب رائے صاحب سے ملنے آنے جانے لگے تھے۔ راج کی ذہانت اور طبیعت کی خوش مزاجی کے باعث میری والدہ اور دیگر افرادِ خاندان ان سے بہت متاثر ہوئے اور بالآخر وہ سب کے چہیتے ہو گئے۔ میری تعلیم راج کے والد کی سرپرستی میں ہی ہوتی رہی مگر والدہ محترمہ کا یہ خیال کہ مجھے کسی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ مجھے موروثی معاش منصب و سلمداری ملا کرتی تھیں۔ مگر راج کی سفارش پر میری والدہ مجھے اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے پر راضی ہو گئیں۔ راج کے تعلیمی ماحول اور ان کے تعلیمی ذوق کا یہ اثر ہوا کہ میری دو بہنیں بھی جو پردہ کے باعث گھر سے باہر نہیں نکلا کرتی تھیں زنانی مدرسہ میں شرکت حاصل کر لیں۔

راج کے گولی پورہ کے قیام کے دوران میں تعطیلات میں وہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اور اس وقت کی چند باتیں جو مجھے یاد ہیں وہ تحریر کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ کہ راج کے چچا جناب محبوب نارائن گوڑ اور خود راج اور بسا اوقات بالا پرشاد صاحب گوڑ (ماہر فلکیات) کے درمیان آپس میں علمی مباحث چھڑ جاتے تھے اور گھنٹوں آپس میں بحث و مباحثہ ہوتا رہتا۔ مباحث کا زور و شور رہائشی مکان کے گلی کے کونے تک بھی سنائی دیتا تھا۔ منشی پریم چند کی ناول ہو یا پھر کانگریسی رہنماؤں کی سوانح حیات یا مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالے کا مضمون چچا و بھتیجے کے مباحث کے بغیر ان کا مطالعہ نامکمل ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں میں نے یہ دیکھا کہ بعض مرتبہ راج ہی کو کھانا بنانا پڑتا تھا اور وہ بہت لذیذ اور ذائقہ دار کھانے بناتے ہیں۔

راج کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق رہا ہے چنانچہ اپنے سکونتی مقام گولی پورہ میں انھوں نے ایک دارالمطالعہ قائم کر رکھا تھا۔ میں نے بھی اس کی رکنیت حاصل کر لی اور رکنیت کی ماہانہ فیس چار آنہ تھی راج بحیثیت معتمد دارالمطالعہ اپنی دستخط سے رسید جاری کیا کرتے تھے اور یہ کوئی ۱۳۴۸ فصلی م ۱۹۳۸ء

کی بات ہے دارالمطالعہ کے علاوہ محلے کے نوجوانوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تقریری مقابلے منعقد کئے جاتے تھے۔ اور ان مقابلوں میں کامیاب ہونے والے بچوں کو چھوٹی کتابیں بطور انعام دی جاتی تھیں چنانچہ مجھے بھی انعام حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوتا رہا۔

راج کی پہلی شادی موضع نظام آباد ضلع اعظم گڑھ (یوپی) میں شریمتی سوجو گتا سے رچائی گئی۔ اس میں میری والدہ کی زیادہ دلچسپی رہی اور وہ اپنے پورے پریوار کے ساتھ یوپی کا سفر اختیار کیں اور بہو کو اپنے گھر بیاہ کر لائیں۔ راج کو سوجو گتا سے جو بعد میں کوکیلا کے نام سے پکاری جانے لگیں دو لڑکے پیدا ہوئے مگر سوئے قسمت کہ دونوں زندہ نہیں رہے۔

طالب علمانہ زندگی میں میں اور راج اس طرح ساتھ ساتھ رہنے لگے تھے کہ ہم دونوں کو اکثر لوگ بھائی بھائی سمجھتے رہے۔ پبلک میٹنگ یا سینما دیکھنے جانا ہو تو راج کی سفارش پر ہی مجھے والدہ اجازت دیتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راج اور میں سائیکل پر ہی گھوما کرتے تھے۔

راج کی طبیعت میں خوش مزاجی بچپن ہی سے موجود ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوتے اور جس محفل میں شریک ہوتے ان محفلوں میں ایک جان پڑ جاتی تھی۔

راج جب ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے تھے تو وہ مضمون کی درسی کتب کے ساتھ ساتھ اسی مضمون کی کئی اور انگریزی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔ جن میں سے اکثر کتب وہ خرید ابھی کرتے تھے اس طرح درسی کتب کے ساتھ ساتھ اسی مضمون کی دیگر کتب کی ایک علٰحدہ لائبریری بھی تھی۔

مجھے بھی اپنی تعلیم کے دوران ان کتب سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ راج ڈرائینگ اور خوش نویسی بھی اچھی کر لیا کرتے تھے۔ تحریر خوشخط اور پختہ ہے۔ انٹرمیڈیٹ پاس کر کے راج شروع میں آریہ سماجی تحریک سے متاثر ہوئے اس کے بعد کھادی تحریک سے جڑ گئے اور گھر گھر گھوم کر کھدر بیچا کرتے تھے اور خود بھی پہنا کرتے تھے اور اس طرح دوست احباب اور اپنے افرادِ خاندان کو بھی کھادی پہننے کی ترغیب دیتے رہے میں نے خود بھی ۱۹۴۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور دیش کے آزاد ہونے تک کھدر پہنتا رہا۔

راج کا سیاسی رجحان ترقی کرتا ہوا سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور اس زمانے میں کامریڈز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا جس کے روح رواں جناب عالم خوندمیری مرحوم تھے۔ ایسوسی ایشن

کے بانیوں میں کامریڈ مخدوم محی الدین۔ جناب سید ابراہیم۔ جناب غلام حیدر صاحب اور مرزا حیدر حسن صاحب۔ جناب جواد رضوی صاحب اور دیگر ساتھی شامل ہیں۔ راج بھی اسی ایسوسی ایشن کے رکن بن گئے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں راج کا کمیونسٹ پارٹی سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور ۱۹۴۰ء سے راج کی اشتراکی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ راج کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی اور اشتراکی تحریک میں حصہ لینے کے باعث ان کے دوست احباب اور ان کے قریبی عزیز و اقارب راج کی اپنے گھروں پر آمد سے گھبرانے لگے۔ یہ ڈر اور خوف اس لیے پیدا ہوا کہ اکثر کائستھ گھرانوں کو اس وقت کے حکمرانوں سے کچھ نہ کچھ مراعات بشکل وظیفہ منصب و معاش جاری تھیں۔ خوف تھا کہ کہیں یہ مسدود نہ ہوجائیں۔ میری والدہ بھی اس خیال سے کبھی کبھی گھبرا جاتی تھیں مگر میری والدہ کو میرے اطمینان دلانے پر تشفی ہوجاتی تھی۔

گھر کے چھوٹے بڑے گو راج کے سیاسی خیالات سے پوری طرح متفق نہ سہی مگر راج سے ہمدردی ضرور کرنے لگے تھے۔ راج اپنی سیاسی زندگی میں کامیابی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ مگر گھریلو زندگی میں انھیں سکون نہ ملا۔ اپنے دو لڑکوں کی موت کا غم دل میں چھپائے پھرتے رہے مگر ہمت و استقلال انھیں دلاسا دیتے رہے۔

کمیونسٹ پارٹی پر امتناع کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۴۸ء میں راج اور دیگر کمیونسٹ رہنما روپوش ہونے پر مجبور ہوگئے۔ انڈر گراؤنڈ رہ کر وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھے۔ روپوشی کے زمانہ ہی میں راج کی دوسری شادی برج رانی گوڑ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے دو لڑکیاں تمارا اور کلارا پیدا ہوئیں۔ راج ان دونوں لڑکیوں سے بیحد پیار کرتے ہیں۔ چھوٹی لڑکی کلارا جس کی منگولین Mongolian پیدائش ہے۔ راج اس کو بہت چاہتے ہیں اور اس کی ذرا سی بھی تکلیف انھیں برداشت نہیں ہوتی۔ کلارا کی شادی سینتھ سے ہوئی اور اس کو ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امروتا ہے۔ تمارا کی شادی سری بالاجی راؤ سے ہوئی اور انھیں اب دو لڑکے ہیں جن کا نام پروین اور پون ہیں۔ راج نے اپنے نواسہ کے اصرار پر ہی ۱۹۹۰ء میں اپنی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے، جس کو ان کے نواسے نے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔

Nana - An interveiw with Dr. Raj Bahadur Gaur

۱۹۳۸ء میں جب کہ راج یونیورسٹی کے ہاسٹل میں مقیم تھے اس وقت "وندے ماترم تحریک"

کا آغاز ہوتا ہے اور راج ایک روزہ احتجاجی ہڑتال میں شریک ہوئے ہیں وہ جس وقت میڈیکل کالج کے طالب علم تھے سیاسی میدان میں ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے اتر جانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے تعلیم ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے اس فیصلے سے خاص طور پر ان کے والد اور ہم سب کو بڑا دکھ ہوا ہم سب نے ان سے خواہش کی کہ وہ ڈاکٹری کی تعلیم پوری کر لیں اور ڈگری حاصل کر لیں اور پھر اس کے بعد سیاسی میدان عمل میں اتر جائیں۔ مگر راج اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ اس وقت اُن کے والد جناب محبوب رائے گوڑ بمبئی روانہ ہوئے اور اس وقت کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کامریڈ پی سی جوشی سے ملاقات کی اور انھیں اپنی خواہش سے مطلع کیا اور راج کو اپنی تعلیم مکمل کر لینے کی ہدایت چاہی معلوم نہیں راج نے آیا کامریڈ پی سی جوشی کے کہنے پر یا میڈیکل کالج کے اساتذہ کے مشوروں پر ۱۹۴۳ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی۔

راج نے ہمیشہ ہی سے گھر کے معاملات اور بکھیڑوں سے اپنے آپ کو دور رکھا مگر جب کسی مسئلہ کی ذمہ داری ان پر عاید کر دی جاتی تو وہ نبھانا بھی خوب جانتے ہیں۔ چناں چہ میری والدہ کے انتقال کے بعد مجھ سے بڑی میری ہمشیرہ محترمہ لیلاوتی بی بی کی شادی کی فکر ہم سب کو کھائے جا رہی تھی۔ راج نے اس سلسلہ میں پہل کی اور ہم دونوں رشتہ کی تلاش میں اورنگ آباد پہنچے اور کامریڈ چندر گپت چودھری کے گھر قیام کیا۔ اورنگ آباد سے ہم تعلقہ ویجاپور روانہ ہوئے اور وہاں رائے لالہ بندو پرشاد سری واستوا سے ملاقات کی راج کی چوں کہ ان سے پہلے ہی سے جان پہچان تھی اس لیے رشتہ کی بات چھیڑ دی گئی۔ لالہ بندو پرشاد جی کا شمار اس وقت مہاراشٹر کے چوٹی کے کانگریسی لیڈروں میں تھا۔ وہ سوامی رامانند تیرتھ کے گروپ سے وابستہ تھے۔ بہر حال ہمارے ویجاپور کے قیام کے دوران رشتہ کی بات چیت ثمر آور ثابت ہوئی اور میری ہمشیرہ کی شادی لالہ جی سے ۱۹۴۵ء میں بلدہ حیدرآباد میں انجام پائی۔ اورنگ آباد کے اس مختصر قیام میں ہم دونوں نے ایلورہ اور اجنتا کی سیر بھی کی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں اورنگ آباد سے ایلورہ سائیکلوں پر ہی روانہ ہوئے۔ [گو راج کو دل و دماغ پر قابو رکھنے میں کمال حاصل ہے مگر خاندان کی لڑکیاں جب بیاہی جاتی ہیں تو یہ وقتِ رخصتی قابو کھو بیٹھتے ہیں اور رو پڑتے ہیں]

دیش کی آزادی سے قبل اکثر سیاسی رہنماؤں کے جلسوں کا مرکز حشمت گنج سلطان بازار تھا

کرتا تھا۔ میں بھی راج کے ساتھ اور خود راج کو سننے کئی بار حشمت گنج جاتا رہا ہوں۔ حشمت گنج کا ایک دلچسپ واقعہ جو مجھے یاد آرہا ہے وہ یہ تھا کہ روپوشی کے زمانے میں یعنی اوائل ۱۹۴۸ء میں جب کہ ان پر گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ ایک پبلک میٹنگ کا اعلان کیا گیا کہ راج بہادر گوڑ اس جلسہ کو مخاطب کریں گے۔ اس اعلان پر پولیس نے حشمت گنج کے میدان کے دونوں جانب کے گیٹ کو بند کروادیا اور جلسہ گاہ کا محاصرہ کرلیا۔ اعلان کے مطابق راج بہادر گوڑ نے تقریر کی اور تقریر کے فوری اختتام پر روشنی بجھا دی گئی اور پھر تاریکی میں جلسہ گاہ میں پبلک نے ایک اور صاحب راج ملیاجی کو گھیر کر راج بہادر گوڑ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور اس دوران راج وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور اس طرح پولیس کو بڑی شکی ہوئی۔

ایک اور واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ تھا کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کا انتقال ان کی دیوڑھی واقع شاہ علی بنڈہ میں ۱۹۴۰ء میں ہوا اس وقت راج بہادر گوڑ ہمارے گھر ہی ٹھہرے تھے اس لیے میں اور راج مہاراجہ کی ارتھی کے جلوس میں شاہ علی بنڈہ سے پرانا پل پیدل چل پڑے۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ حشر کا منظر پیش کررہا تھا۔ بھجن اور اشلوک فضا میں گونج رہے تھے۔ ڈھولک جھانج مجیرے ایک خاص سماں پیدا کررہے تھے۔ بہر حال اس تاریخی جنازہ کے جلوس میں ہم اپنی شرکت کو بھول نہیں سکتے۔

راج کی روپوشی کے زمانے میں مختلف ناموں سے ہم میں خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ بسا اوقات مجھے تو کوریر Courier کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ راج کی گرفتاری کے سلسلے میں کئی بار ہمارے گھر پولیس کے دھاوے ہوتے رہے۔ اور تلاشی لی جاتی رہی۔ خفیہ پولیس کے عہدہ دار تلاشی کے دوران مجھ سے یہ کہا کرتے تھے کہ تمہارا گھر عجیب بھول بھلیاں ہے۔ کیا تمہارے آباواجداد کیمونسٹوں کے روپوشس ہونے اور پناہ لینے کے لیے ہی اس طرح کا مکان بنا رکھے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ میں نے وکالت شروع کردی تھی۔ اور روپوش کیمونسٹ قائدین کی وکالت کرنے لگا تھا اور ان قائدین کی رہائی کے لیے حبس بیجا کی درخواستیں ہائی کورٹ میں پیش کی جاتی رہیں۔ ان سیاسی مقدمات میں میری رہنمائی بیرسٹر عطاالرحمٰن مرحوم اور غلام پنجتن صاحب کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ عدالت عالیہ کے اس وقت کے چیف جسٹس نے سرکاری وکیل کو اپنے اجلاس پر طلب کرکے یہ استفسار

کیا کہ کیا منوہر راج سکینہ بحیثیت وکیل کمیونسٹ رہنماؤں کی پیروی کر رہے ہیں اور اس لیے پولس ان کے گھر کی بار بار تلاشی لے کر انھیں اپنے فرض سے باز رکھنا چاہتی ہے. اور اگر ایسا ہے تو آپ پولس کو آگاہ کریں کہ وہ سکینہ کو پریشان نہ کریں. روپوشی کے زمانے میں راج کبھی کبھار ہم لوگوں سے ملنے آیا جایا کرتے تھے ایک بار ایسا ہوا کہ وہ پہنچنے ہی والے تھے کہ پولس نے میرے مکان کو گھیرے میں لے لیا راج سائیکل پر آئے اور میرے آفس کی کھڑکی پر پیر بھی دھرنے نہ پائے تھے کہ میرا اشارہ پاکر گلی کے دوسرے سرے سے غائب ہو گئے اور پولس انھیں پہچان نہ سکی. راج کی روپوشی کے زمانے میں شاید فروری ۱۹۴۸ء میں ان کی بیوی کو کیلا کو انتہائی رازداری برتتے ہوئے وجے واڑہ لے گیا جہاں راج روپوش تھے اور وہاں انھیں چھوڑ کر حیدرآباد لوٹ آیا.

راج نے کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے ساتھ ٹریڈ یونین تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا. کامریڈ مخدوم. کامریڈ وی. ڈی دیشپانڈے. کامریڈ ناگاپورکر. جناب جواد رضوی اور دیگر احباب کے ساتھ مختلف یونینوں سے وابستہ ہو گئے. ٹریڈ یونین تحریک بڑھتی گئی ہڑتال جلسے جلوس ہونے لگے. حکومت کی طرف سے بار بار وارنٹ گرفتاری ان رہنماؤں کے خلاف جاری ہوتے رہے. اور گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ روپوش ہو جایا کرتے تھے. اسی زمانے کا ایک اہم واقعہ جو غالبا ۱۹۴۷ء کا ہے راج بہادر گوڑ جنھیں گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا تھا. جیل سے دانتوں کے علاج کے لیے عثمانیہ دواخانہ لائے گئے علاج کا بہانہ تھا اور فراری عین مقصد تھا اس لیے بڑی خوبی سے پلان بنایا گیا اور انتہائی ڈرامائی طریقہ سے راج کو دواخانہ کے مردہ خانہ کے احاطہ سے فرار کرا دیا گیا. اس ڈرامہ میں ڈاکٹر ریس پیرابیچے. جناب رفیع احمد. کامریڈ نظام الدین اور باسط نے بڑی خوبی سے اپنا کردار نبھایا.

اسی زمانہ میں کمیونسٹ رہنماؤں کی قانونی مدافعت کے لیے یک کمیٹی "پیوپلز ڈیفنس کمیٹی" Peoples Defence Committee کا قیام عمل میں آیا جس کا مجھے معتمد مقرر کیا گیا. بحیثیت معتمد ڈیفنس کمیٹی کمیونسٹ سیاسی قائدین سے ملاقات کے لیے مجھے اکثر جیل جانا پڑتا تھا. اس زمانہ میں ان رہنماؤں سے ملاقات کی شرائط بھی کافی کڑی تھیں. ملاقات کے لیے ہوم سکریٹری

سے اجازت کا لزوم تھا اور اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی جیل میں ہماری ملاقاتیں عہدہ داران جیل کے بالمواجہ ہوا کرتی تھیں ملاقات کے لیے ایک خاص میز بنوایا گیا تھا۔ جس کے درمیان ایک جالی نصب کر دی جاتی تھی میز کی ایک جانب سیاسی رہنما دوسری طرف وکیل۔ انہی ملاقاتوں کے درمیان راج کو کچھ کتب اور کھانے پینے کی چیزیں پہنچائی جاتی تھیں۔ اور اسی دوران راز کی چٹھیاں بھی ان تک پہنچا دی جاتی تھیں۔

راج بہادر گوڑ تلنگانہ ہتھیار بند لڑائی میں اپریل ۱۹۵۱ء میں راج کنڈہ کی پہاڑیوں میں گرفتار ہوئے ان کی گرفتاری کو مقامی پولس نے اپنا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا اور اس گرفتاری کی خبر کو آگ کی طرح پھیلا دیا۔ اس وقت ریاست حیدرآباد میں ملٹری حکومت کا دور دورہ تھا۔ کمیونسٹ تحریک کو بُری طرح کچلا جا رہا تھا۔ اس ظلم استبداد کی حکمرانی میں راج کی زندگی کو خطرہ تھا۔ ہم سب ان کی گرفتاری سے بہت زیادہ فکرمند اور پریشان تھے۔ میں راج کے والد کو لے کر ورنگل پہنچا جہاں راج کو بے رحم ملٹری حکمران جس کا نام ننجپا Nanjappa تھا۔ اپنے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں قید کر رکھا تھا۔ راج کی رہائی کے لیے میں اور راج کے والد ننجپا سے ملنے ان کے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ جب راج کے والد راج کی رہائی کی درخواست کی تو ملٹری آفیسر آگ بگولہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ تلنگانہ کی تحریک کے سلسلہ میں جن لوگوں کا قتل ہوا ہے۔ اس کا ذمہ دار تیرا بیٹا ہے اور تو ایسے آدمی کو چھڑانے آیا ہے۔ تیرے بیٹے کو تو گرفتاری کے ساتھ ہی فوراً گولی مار دی جاتی مگر چونکہ اس کی گرفتاری کی اطلاع حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو پہنچ چکی تھی اور اخباروں میں بھی خبر شائع ہوچکی تھی اس لیے تیرے بیٹے کی جان بچ گئی غرض اس نے راج سے ملنے اور انھیں رہا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی دوران ہمیں معلوم ہوا کہ راج کو نلگنڈہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہم بھی ورنگل سے نلگنڈہ پہنچے۔ راج نلگنڈہ پولس اسٹیشن میں موجود تھے۔ پولس اسٹیشن کے سلاخوں والی ایک کھڑکی سے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا میں نے فوری ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اجلاس پر ضمانت کی درخواست پیش کر دی۔ مجسٹریٹ نے درخواست ضمانت منظور کر دی مگر اسی دوران راج کو قانون نظر بندی کے تحت احکام نظر بندی تعمیل کر دیے گئے۔ اس وقت کے کلکٹر جناب ہادی جعفری تھے۔ اسی رات ان کے مکان پہنچ کر میں نے درخواستِ رہائی پیش کر دی۔ مگر کلکٹر صاحب کوئی فیصلہ صادر کئے بغیر رخصت حاصل کر کے بلدہ روانہ

ہو گئے۔ جب راج راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہوئے تو انھیں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ہدایت پر، جو کہ اس وقت نائب صدر جمہوریہ ہند تھے راج کو ماہ مئی ۱۹۵۲ء میں نظر بندی سے رہا کر دیا گیا۔ گو راج کا انتخاب راجیہ سبھا کے لیے چار سال تھا مگر میعاد کے اختتام پر انھیں دوسری بار راجیہ سبھا کا ممبر چن لیا گیا۔ اس طرح وہ ۱۹۶۲ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے۔

راجیہ سبھا کی رکنیت کے زمانہ میں راج کا قیام کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹرس Windsor Place نئی دہلی میں رہا۔ اس زمانہ میں میں اور میری بیوی کا ننا کچھ دن ان کے ہاں ٹھہرے اور دیکھا کہ راج اپنی زندہ دلی کے باعث اپنے پارٹی کے ساتھیوں اور ممبران پارلیمنٹ میں کافی مقبول نظر آئے۔ چوں کہ راج میں خاموش رہنے کی عادت نہیں ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی خاموش نہیں رہنے دیتے تھے۔

جس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتوں پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے پابندی لگا دی گئی تھی چند ترقی پسند احباب نے ایک نئی جماعت "پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی" Peoples' Democratic Party کے نام سے قائم کی۔ اس پارٹی کی عاملہ کا میں بھی ایک رکن تھا۔ بعد ازاں اس پارٹی کو وسیع بنیادوں پر "پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ" Peoples' Democratic Front "عوامی جمہوری محاذ" میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے چناؤ کا اعلان کیا گیا۔ عوامی محاذ میں شامل رہنماؤں میں قابل ذکر ڈاکٹر جے سوریہ نائیڈو۔ جناب اختر حسن۔ جناب خورشید حسن۔ جناب وی۔ڈی دیش پانڈے ہیں۔ اس وقت کے انتخابی جلسوں میں کثرت سے عوام شریک ہوتے اور محاذ Front کے امیدواروں کی تائید کا اظہار کرتے تھے۔ انتخابات کے زمانے میں مجھے نظر بند رہنماؤں سے ملاقات کرنے جیل جانا پڑتا تھا۔ مرہٹواڑہ کے چند کمیونسٹ لیڈر اورنگ آباد جیل میں نظر بند تھے۔ ان کے پرچۂ نامزدگی کی خانہ پری کے لیے اورنگ آباد جیل بھی جانا پڑا۔ ۱۹۶۲ء میں راج حلقہ شاہ علی بنڈہ کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ تمام لوگوں کا خیال تھا کہ راج اس حلقہ سے انتخاب جیت جائیں گے۔ مگر توقع کے خلاف راج کو شکست ہوئی۔ راج کے الکشن ہار جانے پر اس حلقہ کے بیشتر احباب الکشن آفس پہنچ کر اظہار افسوس کرتے رہے۔ جس پر کامریڈ مخدوم محی الدین نے کہا کہ

جتنے لوگ اظہار افسوس کے لیے ہم سے مل رہے ہیں کاش وہی حضرات راج کو ووٹ دے دیتے تو راج جیت جاتے۔

۱۹۷۸ء میں پارلیمنٹ کے حلقہ سکندرآباد کے لوک سبھا انتخابات کے لیے راج کو کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا گیا۔ اس زمانے میں مجھے راج کے ساتھ حلقہ سکندرآباد کی اکثر بستیوں میں گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ وکلاء برادری اور موکلین کے علاوہ میرے دوست احباب بھی اس حلقہ میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ جس پر راج نے ایک بار تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میری جگہ منوہر راج کھڑے ہو جاتے تو انھیں اس حلقہ سے زیادہ ووٹ مل سکتے تھے۔

راج بہادر گوڑ اردو زبان کی بقا و ترویج میں ایک عرصہ سے لگے ہوئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے آپ کی وابستگی لگ بھگ چار دہوں سے چلی آرہی ہے۔ اور آج اردو کی ہر مجلس اور محفل میں راج موجود نظر آتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے آپ ایک سرگرم رکن بھی ہیں اور رہنما بھی۔ راج انجمن ترقی اردو (ہند) کے حیاتی رکن ہیں۔ دو دفعہ نائب صدر منتخب ہو چکے ہیں اور وہ انجمن کی ادبی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔

راج نے اردو زبان کی بقا و ترویج کے لیے اپنی ہمہ وقتی خدمات کا نہ صرف نذرانہ پیش کیا ہے بلکہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بھی وقف کر دیا ہے۔

انھوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق امور کا جائزہ لینے والی سردار جعفری کمیٹی کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے اس کمیٹی کی رپورٹ کی تیاری میں اپنا زیادہ وقت اور تعاون دیا۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیٹی جناب عزیز قریشی صاحب کی قیادت میں قائم کی گئی تھی۔ راج اس کمیٹی کے بھی رکن رہے۔ اردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق بہتر مواد اور اعداد و شمار بھی آپ نے فراہم کیے تھے۔

راج نے اپنی عمر اور صحت کا خیال کرتے ہوئے اب کمیونسٹ پارٹی کے کسی عہدہ کو قبول نہیں کیا بلکہ نوجوان خون کو آگے بڑھنے کا موقع عطا کیا اور اس طرح اپنی مصروفیت کا زیادہ حصہ ادبی مطالعہ پر صرف کرنے لگے ہیں۔ جس کے باعث وہ مختلف ادبی کتب اور شعری مجموعوں پر

تنقید و تبصرہ فرماتے ہیں۔ راج کی تین کتابیں "ادبی مطالعے" "ادبی مناظر" اور "ادبی جائزے" شائع ہو چکی ہیں۔ راج کو چند سال پہلے دہلی اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام سے نوازا گیا۔

ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے پھوٹ پڑنے پر راج بہت بے چین ہو جاتے ہیں اپنی زبان و قلم سے فرقہ پرستی اور مذہبی منافرت کے خلاف آواز اٹھانے اور لڑنے نکل پڑتے ہیں۔

راج کو اپنے سیاسی مزاج ادبی ذوق سے ہٹ کر دستوری مسائل اور قانون سے بھی بڑی دلچسپی ہے وہ اکثر پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے وکلاء صاحبان کی گروپ میٹنگ کو مخاطب کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے وکیل دوست احباب سے سپریم کورٹ کے فیصلوں پر تبادلۂ خیال بھی کرتے رہیں۔ دھرم شاستر اور شرعی مسائل پر ان کا اپنا علاحدہ نظریہ ہے ان تمام باتوں سے مجھے یہ لگتا ہے کہ راج اگر ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کی بجائے وکالت کی سند حاصل کر لیتے تو ایک کامیاب ترین وکیل ثابت ہوتے۔

آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ میں راج کے طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کا ہم سفر رہا ہوں راج پچھتر ویں سال کی منزل پر پہنچ کر گو جسمانی طور پر تھکن محسوس کرنے لگے ہیں۔ مگر ان کی زبان اور قلم کبھی تھکے ہیں نہ تھکیں گے۔ راج اس مقولہ پر اپنی زندگی بتا رہے ہیں۔

" زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں "

شمیم جہاں

ہمارے گوڑ صاحب

برف کی طرح سفید بال، شام کی طرح سانولا رنگ، ذہین مسکراتی پیاری بھری مشفق آنکھیں، درمیانہ قد ہنستا ہوا چہرہ، یہ ہیں ہمارے گوڑ صاحب۔ ان کی ہمہ جہت، رنگا رنگ اور باغ و بہار شخصیت کی تعریف کیا اور کیسے کروں۔ ان کی شخصیت میں اوصاف کی افراط اور میرے پاس الفاظ کا فقدان۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر حکم ہے کہ اختصار سے کام لوں۔

گوڑ صاحب سے پہلی ملاقات انجمن میں ہوئی، انھوں نے بے لوث محبت، خلوص اور بے تکلفی کی ایسی فضا قائم کی کہ مجھے ان سے ایک عقیدت سی ہو گئی۔ اُن سے میرا یہ رشتہ تقریباً اٹھارہ سال پُرانا ہے، لیکن میں اس رشتے کو آج تک کوئی نام نہیں دے سکی۔ کبھی وہ بزرگ، مشفق باپ کی طرح پیش آتے ہیں۔ کبھی بڑے بھائی کی طرح ہمت و حوصلہ بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی ہم عمر دوست کی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے ماحول کو قہقہہ زار بنا دیتے ہیں۔

اردو گھر کی لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ گوڑ صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہیں سے آواز لگاتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اے خلیق! سنو، تمھاری لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ یا جو انھیں کہنا ہے، وہ لفٹ کے دروازے سے نکلتے ہی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی کسی بھی موضوع پر گرما گرم بحث شروع، بحث کا موضوع اکثر وہ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ لیکن گوڑ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ بحث کا موضوع خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو، تلخی پر ختم کبھی نہیں ہوتا۔

انجمن ترقی اُردو سے گوپر صاحب کا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس کے نائب صدر رہے اور اب مجلسِ عام اور مجلسِ عاملہ کے رُکن ہیں بلکہ انجمن ترقی اُردو سے ان کا روحانی تعلق ہے، جیسا کسی عابد کا مسجد سے اور پجاری کا مندر سے۔ ممکن نہیں کہ گوپر صاحب دلی تشریف لائیں اور اُردو کے اس مندر میں حاضری نہ دیں۔

گوپر صاحب اپنے مرتبے، علم اور اب عمر کے اعتبار سے بھی بزرگ کہلانے کے مستحق ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی عزت اور احترام اس طرح کیا جائے جیسے اپنے بزرگوں کا کیا جاتا ہے، لیکن وہ بندۂ خدا موقع ہی نہیں دیتے۔ ان کی سیمابی فطرت لمحہ بھر کے لیے بھی انھیں خاموش نہیں بیٹھنے دیتی۔ زندہ دلی انھیں بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔ ان کی خوش مزاجی زندگی کی تمام کڑواہٹوں کو پی جاتی ہے۔ وہ اپنے قہقہوں میں ہر دُکھ درد کو اس طرح اُڑا دیتے ہیں جیسے سگریٹ کا دھواں۔ ایسا نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی غم نہیں کوئی دُکھ نہیں۔ رنج و غم تو انسان کے پیچھے سائے کی طرح لگے رہتے ہیں لیکن انھیں زندگی کو خوش اسلوبی سے جینے کا ہُنر آتا ہے۔ گوپر صاحب خوشی بانٹتے ہیں، غم نہیں بانٹتے۔ اپنے غموں اور دُکھوں سے وہ تنہا لڑنے کے قائل ہیں۔ زندگی میں اُن کا رویہ کچھ اس طرح ہے ؎

ہم کو طوفان سے لڑنے کا ہُنر آتا ہے
آپ ساحل پہ کھڑے ہو کے تماشا دیکھیں

گوپر صاحب کو میں نے کبھی خاموش یا اداس نہیں دیکھا۔ ماحول کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو وہ مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے لطیفے سنانے، ہنسنے اور ہنسانے میں کہ آدابِ محفل بھی بھول جاتے ہیں۔ ایک لطیفہ جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں سنایا، آپ بھی سُنیے: اُردو گھر میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے کمرے میں کچھ حضرات بیٹھے تھے۔ گوپر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ بات چل رہی تھی عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کی۔ گوپر صاحب نے عورتوں کی حمایت میں بولتے ہوئے یہ واقعہ سنایا: ”میں اور میری بیوی ایک پارٹی میں شریک تھے۔ وہ

یہی بحث چل رہی تھی۔ ایک صاحب کہنے لگے، بھئی: عورتیں چھوٹے موٹے کام تو کر سکتی ہیں کوئی بڑا کام کرنا عورتوں کے بس کا نہیں۔ کسی بڑی دعوت کا انتظام کرنا ہو تو مرد کرتے ہیں۔ اچھا اور زیادہ کھانا بنوانا ہو تو مردوں کو بلایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سُن کر ہماری بیوی نے جواب دیا۔ ایک دو بچّے پیدا کرنا ہو تو عورتیں کر دیں گی۔ اگر دس پانچ بچّے پیدا کرنا ہو تو مرد خود کرلیں۔

میں نے ہمیشہ گوڑ صاحب کو کمزوروں کی حمایت میں بولتے سُنا ہے۔ سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتے سُنا۔ میں گوڑ صاحب سے نہایت مؤدبانہ طور سے معذرت کے ساتھ ایک سوال (جو مجھے دسمبر ۱۹۸۸ء سے پریشان کیے ہوئے ہے اور میرے سر میں ہمیشہ سر اٹھاتا رہتا ہے) پوچھنے کی گستاخی کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اپنی ازدواجی زندگی میں کتنی عورتوں کے ساتھ اپنے انصاف کے اصولوں پر عمل پیرا ہیں؟ اگرچہ یہ سوال بہت نجی قسم کا ہے اور جسے اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لیکن گوڑ صاحب کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں اور بڑے لوگوں کی نجی زندگی میں جھانکنے کی روایت بہت پُرانی ہے۔

آج فرقہ پرستی اور منافرت کے اس دور میں ہر شخص اپنی عیاری اور نفرت کو چھُپانے کے لیے سیکولرزم کا خول پہن کر بھائی چارے کا گیت الاپ رہا ہے۔ ملک و قوم کی خدمت کا نعرہ لگا رہا ہے۔ لیکن قول و فعل کا یہ تضاد چھُپا نہیں ہے۔ پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کا یہ شعر ایسے ہی لوگوں پر صادق آتا ہے ؎

نعرہ گرمِ انقلاب میں نے بھی ہاں سُنا تو ہے
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن سے دُور دُور

لیکن راج بہادر گوڑ صاحب ان چند لوگوں میں سے ہیں جو انسان دوستی اور سیکولرزم کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ انسانیت ان کا ایمان ہے۔ محبت اُن کا مذہب۔ گوڑ صاحب انسانیت کی اعلا قدروں کے محافظ، ملک و قوم اور اُردو زبان کے سچّے مجاہد ہیں۔ انھوں نے جام و سبو کی زندگی ترک کر کے دار و رسن کا راستہ اختیار کیا اور اپنی زندگی کا وہ خوبصورت

دور جب انسان دنیا کی ہر خوشی اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں سوچنے کی اسے کہاں فرصت ہوتی ہے، وہ تو بس اپنی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل چاہتا ہے۔ لیکن گوڑ صاحب نے یہ وقت ملک و قوم اور ملک کے پس ماندہ اور ظلم کی چکی میں پسنے ہوئے غریب مزدور بھائیوں کی خدمت کرنے میں گزارا۔

تلنگانہ کسان مزدور تحریک کے سلسلے میں بارہا جیل گئے۔ روپوش رہے ہزار صعوبتیں برداشت کیں، لیکن یہ مردِ آہن اپنے موقف سے نہیں ہٹا۔ گوڑ صاحب سیاست کے میدان میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ دو بار الیکشن بھی لڑا۔ لیکن اپنے علاقے میں انتہائی مقبول ہونے کے باوجود الکشن ہار گئے۔ چوں کہ وہ ایک صاف سچے اور کھرے انسان ہیں (اور سچائی، ایمان داری کا سیاست سے جنم جنم کا بیر ہے) اس لیے سیاسی داؤں پیچ اور اوچھے سیاسی ہتھکنڈوں کا انھوں نے استعمال نہیں کیا ورنہ وہ بھی آج منسٹر ہوتے۔ گوڑ صاحب دو بار راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے اور آج بھی سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ سرگرم اور فعّال ہیں۔

اُردو زبان ڈاکٹر صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کی بقاء و فروغ کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ جب اُردو تحریک کی تاریخ لکھی جائے گی تو گوڑ صاحب اُردو کے ان چند عاشقوں میں سے ہیں جن کے نام کے بغیر یہ تاریخ نامکمل ہوگی۔ اُردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ان کی آواز ہندوستان کے کونے کونے میں سُنی جا سکتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا اوڑھنا بچھونا اُردو کی کتابیں ہیں جنھیں وہ ہمیشہ خرید کر پڑھتے ہیں۔ گوڑ صاحب جب بھی دہلی آتے ہیں انجمن کی بُک ڈپو سے خاصی تعداد میں کتابیں خریدتے ہیں۔ شاید یہ سب سے بڑا شوق یہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مجھے اپنے بزرگوں کی محبت، شفقت اور پیار ملا اور مجھے بھی بزرگوں کی عزت و احترام کرنے اور ان کی پیار بھری ڈانٹ کھانے

ہیں جو خوشی اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ ہمارے بزرگ ہی تو ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے ہمارا بچپن ہمیں لوٹا دیتے ہیں۔ گوڑ صاحب ان محترم ہستیوں میں سے ایک ہیں، جو نہایت سادگی، اپنے پن اور بے تکلفی سے کچھ بھی کہہ دیتے ہیں اور بُرا نہیں لگتا۔

ایک دن ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے شمیم صاحبہ کہہ کر کسی کام کے لیے بُلایا۔ کہنے لگے: "یہ کیا تم نے شمیم صاحبہ! صاحبہ! لگا رکھا ہے۔ یہ اپنی بچی ہے میں تو اسے کبھی صاحبہ نہیں کہوں گا۔" اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ گوڑ صاحب آتے ہی کہتے ہیں "شمیم آج میں تیرے ہاتھ کی چائے پیوں گا۔" اور میں خود ان کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔

گوڑ صاحب کا بہت عرصے سے اصرار تھا کہ میں اُن کے ساتھ حیدرآباد گھوم کر آؤں۔ یہ دسمبر ۱۹۸۸ء کی بات ہے۔ میں اُردو گھر پہنچی، دیکھا گوڑ صاحب بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "میں طے کر کے آیا ہوں کہ اس مرتبہ تمھیں حیدرآباد لے کر جاؤں گا۔ موقع اچھا ہے۔ میری بیوی بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ ایک دو لوگ اور ہیں۔ سفر اچھا رہے گا۔ اب نا کی گنجائش نہیں ہے۔ بس فوراً تیار ہو جاؤ۔ ذرا ہمارا حیدرآباد بھی دیکھو، تمھاری دلّی سے اچھا ہے۔" ان کے اصرار کے سامنے میں واقعی نا نہیں کہہ سکی اور رخت سفر باندھ لیا۔ کب حیدرآباد آ گیا، گوڑ صاحب کی پُر لطف باتوں میں سفر کا پتا ہی نہیں چلا۔ حیدرآباد پہنچ کر ایک دن گوڑ صاحب کے یہاں قیام کیا۔ اگلے دن انھوں نے مجھے حسینی شاہد صاحب مرحوم اور ان کی بیگم ساجدہ آپا کی تحویل میں دے دیا۔ اور مخدوم محی الدین صاحب کے صاحبزادے نصرت محی الدین صاحب کو اور اپنی بہن ارجمند رانی کو مجھے حیدرآباد کی سیر کرانے کا چارج دے کر خود غائب ہو گئے۔ اگرچہ ان صاحبان نے میری خاطر تواضع اور سیر کرانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن جنھوں نے حیدرآباد دکھانے کا دعویٰ کیا تھا، ان سے میری ملاقات چار دن بعد انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے دفتر میں ہوئی۔ گوڑ صاحب نے بتایا کہ وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں حیدرآباد سے باہر گئے ہوئے تھے اور کل پھر جا رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ حیدرآباد میں ان کی مصروفیات

کچھ اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

گوڑ صاحب عمر کی جس منزل میں ہیں اس عمر میں انسان کی دماغی اور جسمانی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ گویا زندہ رہ کر بھی انسان زندگی سے بہت دور ہوجاتا ہے۔ اکثر لوگ بیماری اور بڑھاپے کا رونا روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن گوڑ صاحب جو آج سے پندرہ بیس سال پہلے تھے وہی آج بھی ہیں۔ وہی سیاسی سماجی سرگرمیاں، محفلیں، وہی مسلسل سفر، وہی خوش مزاجی اور زندہ دلی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب صحیح معنوں میں زندہ دلانِ حیدر آباد کی نمائندہ شخصیت ہیں۔

میں گوڑ صاحب کی عقیدت مند ہوں، نیاز مند ہوں اور ان کی صحت و سلامتی کی خواہش مند ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔

ڈاکٹر صادقہ ذکی

خواتین ادب اور راج بہادر گوڑ

راج بہادر گوڑ کی تنقیدی تحریروں کا ایک متواتر پہلو خواتین کی سماجی حیثیت ہے۔ انھوں نے بعض موقعوں پر سرسری طور پر اور بعض جگہ بطور خاص عورتوں کی تعلیم و ترقی کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل راج بہادر گوڑ ادب کو سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی پس منظر کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور اس بات کے قائل ہیں کہ معاشرہ میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں، لیکن تاریخی حقیقتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دور کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے خواتین کے سماجی مرتبے، تعلیمی صورت حال، اور عام مسائل کو نظرانداز نہیں کیا۔ کسی ادب پر لکھتے ہوئے کم از کم آزادیِ نسواں کے تعلق سے اس پر نظر ضرور ڈالی ہے۔ اور اپنی بے لاگ رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ کالی داس کی تخلیقات کے نسوانی کردار ہوں، خواتین کربلا ہوں، حضرت محل ہوں، یا "بی اماں" گوڑ صاحب ایسے تاریخی نسوانی کارناموں پر عقیدت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اردو ادب کا دور نشاۃ الثانیہ ہو یا ترقی پسند تحریک کا ذکر ہو، اقبال کے فکر و فن پر بات ہو۔ بیدی کے افسانے ہوں یا قمر جمالی پر مضمون لکھ رہے ہوں۔ راج بہادر گوڑ آزادیِ نسواں اور سماجی انصاف کے نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے بطور خاص سروجنی نائیڈو کے فکر و فن کو سیاسی سماجی اور ثقافتی حالات کی روشنی میں پرکھا ہے۔ منور ماردیوان کی کتاب "انقلاب زندہ باد" پر بھی انھوں نے شاعرانہ تاثرات کا اظہار کیا ہے ان کی اکثر انگریزی اور اردو تحریروں میں صنفِ نازک پر اظہار خیال ملتا ہے۔ انگریزی میں بھی

انھوں نے خواتین پر لکھا ہے۔ انگریزی میں مسلم خواتین پر کئی ماہ پیشتر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو سردست سامنے نہیں ہے۔

بزرگ ادیب راج بہادر گوڑ کی تحریروں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ادب پاروں کی نبض سے روح عصر کو شناخت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ادب سے اس کے دور کا مزاج جھانکتا نظر آتا ہے۔ کالی داس کے ڈراموں شکنتلا اور وکرم اروشی کے متعلق ادیب کملا رتنم کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے [۱]

> دشینت کا شکنتلا کو پہچاننے سے انکار کر دینا اور اس کا واپس اپنی کٹیا میں آجانا اور بھرت کو پال پوس کر بڑا کرنا یا وکرم اروشی میں شہزادی کا اپنی داسی سے کہنا کہ اس کا شوہر اس کی بیوی کی عزت کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ کہیں اور آنکھیں لڑا رہا ہے۔"

اس سلسلے میں راج بہادر صاحب کا خیال ہے کہ کالی داس کے زمانے میں مرد بہت بزدل تھا۔ لیکن عورت کی انا بیدار تھی گویا کالی داس نے اپنے دور کی ایک سماجی حقیقت کو آشکار کیا جو عصری تو تھی لیکن یہ آج بھی صحیح ہے۔ اور اس وقت تک صحیح رہے گی جب تک کہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی برتری باقی رہے گی اور عورت شریک حیات تو ہوگی لیکن شریک کارزار حیات نہ ہوگی۔ گوڑ صاحب کا خیال بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آج شریک کارزار حیات ہونے کے باوجود بھی مرد کا کردار عورت کے مقابلے میں زیادہ مضبوط نہیں ہو سکا۔ یہ عظیم ادب کا ایک سماجیاتی پہلو ہی نہیں ہے بلکہ ایک دائمی حقیقت کا انکشاف بھی کرتا ہے۔ عورت ہمیشہ اپنے ایثار سے اپنی انا کی حفاظت کرتی رہی ہے۔ ہندوستانی عورت کے کردار میں یہ خصوصیت زمانہ قدیم سے تاحال دیکھی جا سکتی ہے۔ بات ماضی کی ہو یا حال کی طبقہ نسواں ہر سطح پر درد و غم کو سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے۔ اور زیادہ تر درد و غم کا ذخیرہ بنانے میں مرد پیش پیش ہوتا ہے اور پھر وہ خود بھی ان خود کردہ گناہوں سے آزردہ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھار یہ تلخیاں ہمارے لوک گیتوں میں نظر آجاتی ہیں۔ گیت انسان کی معصوم تمناؤں اور زندگی کی چھوٹی موٹی حقیقتوں کو جذباتی سطح پر پیش کرتے ہیں۔ غیر مہذب تمدن میں مرد عورتوں کو مارنا بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو

ان کی فوقیت یا برتری کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس مقدس عمل کے فوراً بعد وہ اپنی بیوی کو مٹھائی کھلاتا ہے۔ اور ایسا ہونا کوئی غیر فطری بات بھی نہیں کہ ہر فتح اور عظیم کامرانی کے بعد انسان مٹھائی کھاتا اور کھلاتا ہے۔ راج بہادر صاحب نے دیوندر ستیارتھی کا "گاتا جائے ہندوستان" میں سے حامل مچھیروں کے ایک گیت کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "فنی کشیدہ کاری ہی کو سب کچھ سمجھنے والے اس پر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن کیا اس گیت میں غریب محنت کش عورت کی زندگی کا کربناک کھردراپن پوری شدت سے ظاہر نہیں ہوتا؟" اس گیت میں یہ کہا گیا ہے کہ بیوی کو نہ مارنا" ورنہ رات میں آرام نہ مل سکے گا۔ اس پر گوڑ صاحب کا یہ سوال "کیا اس سے زیادہ سخت انداز میں مرد کو شرمندہ کیا جا سکتا ہے۔" عوامی سطح کو بلند کرنے کے لیے شاید تعلیم و تہذیب اور شائستگی کے لیے سینکڑوں سال چاہئیں۔ لیکن کسی گہرے جمود پر ایک سوالیہ نشان لگا دینے سے حساس ذہن کو ٹھوکر تو ضرور لگتی ہے۔

گوڑ صاحب کے لکھنے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ کسی دور کے ادب کو اپنا موضوع بنائیں لیکن تقابلی سطح پر دنیا کے عظیم لکھنے والوں کی شمع ضرور روشن رکھتے ہیں تاکہ مجموعی طور پر ادب کی عظمت بھی سامنے رہے اور وہ سیاسی سماجی حالات بھی جو ادب کی تخلیق کا نتیجہ ہوتے ہیں کوئی زمانہ ہو اور کوئی جغرافیائی خطہ ہو۔ عورتوں کی کسمپرسی کی کہانیاں ادب کے حوالے سے کبھی کبھار ملتی رہی ہیں۔ اور وہ عام نسوانی کردار بھی جس میں حوصلہ، امنگ، تحمل، مشقت، ایثار، نبرد آزمائی کی امتیازی قدریں ہوتی ہیں۔ اور بعض مرتبہ یہ کردار بزم حیات کی تاریخ کو بھی متعین کرتی ہیں۔ خواتین کربلا کی عظمت اور اہمیت کو انیس کی شاعری کے ذیل میں جس طرح گوڑ صاحب نے دیکھا ہے۔ اس انداز سے شاید نہیں دیکھا گیا۔[۴] ستر ہویں صدی میں جاگیردارانہ سماج عروج پذیر تھا۔ سماجی اور ریاستی سطح پر ہنگامے ہوا کرتے تھے۔ لیکن گاؤں کی زندگی میں ایسی اتھل پتھل نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ "وادی گنگا کے کنارے زندگی ایسے ہی خراماں خراماں گزرتی جیسے گنگا کا دھارا"[۵] لیکن اٹھارویں صدی میں برطانوی سامراجی لوٹ نے ہندوستانی عوام کو جس طرح خالی کر دیا تھا اور ایک عظیم المیہ سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گومتی کے کنارے عزاداری حسین نے اس غم کو غلط کیا۔ نظیر نے بھی یہ تباہی دیکھی تھی اور انیس نے جس طرح حضرت شہربانو اور حضرت

زینب کے کردار پیش کیے ہیں ان سے نہ صرف نسوانی تاریخ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ مرثیہ گو کی ندرت فکر اور عصری تقاضوں سے آگہی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ انیسؔ کی عظمت بھی ہے۔ گوڑ صاحب نے اس پہلو پر جس رخ سے روشنی ڈالی ہے اس سے تحریک آزادی کے سلسلوں کو ملانا بہت آسان ہوسکتا ہے۔ حضرت زینب کم سن بچوں کو جنگ میں شامل ہونے اور ثابت قدمی سے جمے رہنے کے جو طریقے سمجھاتی ہیں۔ اس سے قوم کا نیا کردار ابھرنے میں مدد ملی ہے۔ رزمیہ روایات تازہ ہوئیں۔ اور چھا جانے والی اور ایک "عمومی غم" کو ہندوستانی سماج پر محیط کردینے والی قوت سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ ملا۔ راج بہادر صاحب نے لکھا ہے کہ انیسؔ کی عظیم شاعری کی سماجی افادیت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی عظیم جنگِ آزادی میں حضرت محل کا ایک مضبوط زبردست کردار ابھرتا ہے۔ جس کی تعمیر میں حضرت زینب کو بھی دخل ہے۔ خواتین کربلا سے حوصلہ، ہمت اور حق و جہاد کی فضا بننے میں مدد ملی۔ گوڑ صاحب کا یہ تخمینہ غلط نہیں ہے۔ تحریک آزادی میں اردو شاعری کا اپنا ایک اثر انگیز رول رہا ہے۔ دور جدید میں جوشؔ نے مرثیہ سے ایک نیا موعد لینے کی مثال قائم کی۔ اسی طرح گوڑ صاحب انیسؔ کی مرثیہ نگاری میں سماجی سطح پر معنی خیز اثرات کی کارفرمائی کو محسوس کر رہے ہیں۔

راج بہادر گوڑ نے بالعموم آزادیٔ نسواں اور تحریک آزادی کے تقاضوں کے تعلق سے مختلف ادوار میں خواتین کی کارکردگی پر نظر کی ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ "جاگیردارانہ سماج میں عورت یا تو شمعِ خانہ ہے یا بازار میں شمعِ محفل۔ سماجی کشمکش میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ البتہ صنعتی دور نے اسے آزاد تو کیا لیکن وسعت زنجیر تک۔ بورژوا جمالیات میں عورت کی طرف رویہ محض جنسیات کے تابع ہے۔ یہ تو ترقی پسند تحریک ہی ہے جس نے عورت کو انسان کے روپ میں دیکھا ہے"

بزرگ ادیب نے کم و بیش بات صحیح لکھی ہے۔ لیکن ان کے اس خیال سے پوری طرح اتفاق کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے انھوں نے عالمی حالات کے پیش نظر جاگیردارانہ عہد کی ... کی کوشش کی ہو۔ ہندوستان کے سیاسی سماجی حالات اور دنیا کے سماجی حالات ... فرق ہے۔ ہندوستان کا جاگیردارانہ عہد نسبتاً طویل ہے۔ اسی جاگیردارانہ عہد ...

بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا آغاز سر سید کے دور سے ہوتا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی سے تحریک آزادیٔ نسواں کی جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ اس تحریک کے تحت بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوستانی اور عالمی سطح پر رسائل کا اجراعمل میں آیا۔ یہ رسائل خواتین کے الجھے ہوئے مسائل تعلیمی جدوجہد اور آزادی سے متعلق بے چینیوں کے آئینہ دار ہیں۔ انگلستان میں عورتیں اپنے حقوق منوانے کے لیے پارلیمنٹ کے باہر توڑ پھوڑ کرتی ہیں۔ اور یہ اطلاعیں اخبارات میں چھپتی ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں خواتین جج کے عہدوں پر فائز نظر آتی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں تحریک آزادیٔ نسواں کا فروغ ہوتا ہے۔ جلسے کیے جاتے ہیں۔ آغازِ بیسویں صدی میں اسکالرشپ سے کر عطیہ فیضی لندن میں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ ان سے پیشتر سروجنی نائیڈو انگلینڈ میں قیام پذیر تھیں۔ یہ لوگ اپنے وطن سے باہر رہ کر دنیا کے حالات کا مشاہدہ اور تجربہ کرتی ہیں۔ اور وطن میں واپس آ کر تحریک آزادی و تحریک آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں کی سرگرم کارکن بن جاتی ہیں۔ سر سید کے قیام لندن کے دوران لکھے گئے خطوط میں خواتین کی بیداری کی اطّلاع ملتی ہے۔ شبلیؔ کے سفرنامہ سے اٹلی اور آس پاس کی خواتین کی بیداری اور تعلیم و ترقی کے متعلق خبریں ملتی ہیں۔ حالیؔ جب چپ کی داد اور مناجات بیوہ لکھ رہے تھے تو اس وقت عالمی سطح پر حقوقِ نسواں کی تحریک چل رہی تھی۔ شروع بیسویں صدی اور اس سے پیشتر کے خواتین کے رسائل عالمی حالات کے کالم پیش کرتے تھے۔ نذیر احمد اور رسوا کے ناولوں کے نسوانی کرداروں سے لے کر پریم چند کے نسوانی کرداروں تک خواتین کی نئی تعلیم و تہذیب سے متعلق ایک نئی فضا تعمیر ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے پیشتر تحریک آزادیٔ نسواں کئی مراحل سے گزر چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے بھی عورت کو مختلف حیثیتوں سے دیکھا، صرف جمالیاتی نقطۂ نظر ہی سے نہیں دیکھا۔

گوڑ صاحب یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ نشاۃ الثانیہ کی ہر تحریک کا ایک لازمی جز خواتین کی آزادی ہونا چاہیے۔ لیکن اس اعتبار سے وہ لبرل خیالات رکھنے والے ادیبوں شاعروں سے مایوس بھی نظر آتے ہیں۔ اقبال اور عورت کے ایک ذیلی عنوان[۹] کے تحت انھوں نے لکھا ہے۔

"خواتین کی آزادی کے بارے میں اقبال کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتے تھے۔ جو انھیں فرزندان

تمدن کے غصے کا ہدف بنا دیتی وہ چاہتے تھے کہ عورت خود اس کا فیصلہ کرے کہ زمرد کا گلو بند یا آزادیِ نسواں دونوں میں کون سی چیز زیادہ زینت بخش ہوگی۔ یا نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد ــــــ ظاہر ہے کہ اقبال کے خیالات تعلیمِ نسواں اور آزادیِ نسواں کی نفی کرتے ہیں۔ اقبال کو عورت کے مسائل کا رسمی طور پر احساس ہے۔ وہ دل سے آزادیِ نسواں کے حامی نہیں ہیں۔ اگرچہ تلخیِ حالات کو محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس عقدۂ مشکل کی کشود ممکن نہیں ہے۔ گوڑ صاحب خواتین کی پیچیدہ مسائل اور ان کی نمود سے آزردہ نظر آتے ہیں۔ معاشرہ کی ترقی اور صحت کا دار و مدار عورت اور مرد دونوں کی کارکردگی پر ہوا کرتا ہے۔ جو انسانی ذہن کو انقلابی سمت کی جانب مبذول کردے۔ گوڑ صاحب ایسے ادب کو حقیقتاً عظیم ادب کے ذیل میں رکھتے ہیں گوڑ صاحب نے اپنے مضمون "بیدی ایک عظیم فن کار" میں یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے یہاں عورت کے کتنے روپ ہیں۔ اور کرب کے کتنے رنگ ہیں۔ بیدی کے نسوانی کرداروں پر گوڑ صاحب نے قدرے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ بیدی کی متعدد کہانیوں میں "عورت" اپنی تمام تر نا آسودگیوں، کربناکیوں، آرزوؤں اور ارمانوں کے ساتھ بار بار آتی ہے۔ بیدی کی عورت مجاہد بھلے ہی نہ ہو لیکن بے چین ضرور ہے۔ اس کی یہ بے چینی قارئین کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ راج بہادر گوڑ نے ایک موقع پر کہا تھا ادب میں زندگی اپنے تمام اچھے اور برے پہلوؤں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور ادیب اپنی تخلیق سے ان اقدار کو ابھارتا ہے جو انسانیت کا سر اونچا کرتی ہیں۔ اور زندگی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ ارتقاء ادنیٰ سے اعلا اور اعلا سے اعلا تر کی طرف ہوتا ہے۔ عظیم ادب کی بات ہو یا زندگی کے ایثار طلب پہلوؤں کی بات ہو۔ راج بہادر گوڑ کے نوکِ قلم پر مخدوم کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں ایک نہیں نہ جانے کتنے مضامین انھوں نے لکھے ہوں گے۔ جو کچھ شائع ہو چکے ہیں اور کچھ باقی ہیں۔ ان کی شاعری اور حیات پر لکھتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ مخدوم کے یہاں عورت کا وہ تصور نہیں جو داغ کے یہاں ملتا ہے۔ مخدوم کے یہاں عورت مرد کی شریک حیات ہی نہیں شریکِ رزمِ حیات بھی ہے۔ دراصل حیدرآباد اور اطراف حیدرآباد میں عورتوں کی تعلیم و ترقی کی بات نئی نہیں ہے بلکہ بہت پرانی ہے۔ یہاں کی مستورات نے انیسویں صدی

کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں نکلنے والے رسائل میں متواتر مضامین اور شعری تخلیقات پیش کی ہیں ــــ سروجنی نائیڈو کے والد نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنالیا تھا کہ وہ عورتوں میں تعلیم کو عام کریں۔ راج بہادر صاحب جن کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے اور جو نہایت روشن اور سیکولر مزاج رکھتے ہیں ان کے ناقدانہ خیالات میں خواتین کے سماجی مرتبوں اور سماجی کاموں اور تعلیمی وسعتوں کی تلاش توقع کے عین مطابق ہے۔

انگلینڈ میں ہندوستانی تہذیب کی نقیب اور تحریک آزادی کی سپاہی سروجنی نائیڈو حیدرآباد کی سرزمین پر پیدا ہوئیں۔ اپنی تقریروں اور انگریزی شاعری کی وجہ سے بلبل ہند کہلائیں ان کی حیات اور ذہنی ارتقا پر راج بہادر گوڑ نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ ان کے کاموں اور زندگی کے تمام گوشوں کو روشن کیا گیا ہے۔ لیکن خواتین کی قیادت اور تعلیم نسواں سے متعلق ان کی سرگرمیوں کا پہلو نظرانداز ہوگیا ہے۔ راج بہادر صاحب نے ان کے والد کی تعلیم نسواں سے دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ بہرصورت نہ صرف اہل حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان کے مرد اور عورتیں ان کے کارناموں کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں۔

حیدرآباد کی ایک اور خاتون افسانہ نگار قمر جمالی کی کہانیوں پر انھوں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جو ہمیں ان کی حیات کے مختلف گوشوں سے متعارف بھی کراتا ہے۔ اور ان کے فکر وفن کی نزاکتوں کو پرکھنے اور انھیں شوق کے ساتھ پڑھنے پر آمادہ بھی کرتا ہے۔ راج بہادر صاحب کا خوب صورت مضمون پڑھنے کے بعد قارئین قمر جمالی کی تخلیقات کو شاید دوبارہ پڑھنا چاہیں۔ تنقید اگر لکھنے اور پڑھنے والوں کو تعمیری قدروں کا سبق دیتی ہے تو تبصرے کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گوڑ صاحب اپنی مضمون نگاری اور بعض مرتبہ تبصرہ نگاری میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

"بی اماں" کی شخصیت سے کون ناواقف ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر پر مقالہ لکھتے ہوئے گوڑ صاحب نے جس طرح بی اماں اور ان کے مایۂ ناز فرزند کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شاید ہی کسی نے اس انداز سے لکھا ہو۔ مولانا محمد علی کی شخصیت پر بہت لوگوں نے مضامین لکھے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں یعنی اسلام اور حب الوطنی کو جس طرح انھوں نے سائنٹی فک

بنیاد پر ترتیب دیا ہے، وہ قابل قدر ہے۔ بی اماں کا کردار اور مسلمان ہند کے نام ان کا پیام پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک ضعیف خاتون کس طرح شوق جہاد سے سرشار ہے۔ لکھتی ہیں۔

"میں نے کہہ دیا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے۔۔ کوئی ایسی شرط قبول کر لیں گے جو اسلام کی شان کے خلاف اور مفاد ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ سکیں، اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی اگر کسی دن ہندوستان کے لیے ہوم رول کے جھنڈے کے نیچے ہم سب کو جمع کیا گیا تو انشاءاللہ وہ اس ضعیف کو طالبان ہوم رول کی صف اول میں پائیں گے۔"

راج بہادر صاحب کا یہ اندازہ کہ بی اماں کی مذہبی شخصیت اور حب الوطنی کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی شخصیتوں کی تعمیر میں بڑا دخل ہے، غلط نہیں ہو سکتا۔

"انقلاب زندہ باد" راج بہادر گوڑ کے الفاظ میں منور ماہ و سال کی یادوں کی برات ہے جو ذہنوں میں آزادی کی جنگ کے نقشے کو ابھارتی ہے یا دیں۔ جو تقسیم کے المیہ کا نوحہ ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ گوڑ صاحب نے مخدوم اور فیض کی نظمیں بھی پیش کر دی ہیں کہ یہ بزرگ ادیب کے ذکر و فکر کا بیش قیمت سرمایہ بھی ہیں۔ انقلاب کی نیرنگیوں کو سمجھنے کے لیے اس سرمایہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ راج بہادر خود اس انقلاب کا حصہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ "راج بہادر گوڑ ایک ترقی پسند ناقد ہیں۔ لیکن ایسے انتہا پسند نہیں ہیں کہ صرف مقصدیت ہی کو پیش نظر رکھیں۔ انھوں نے جمالیاتی قدروں کو بھی عزیز رکھا ہے۔" خاص طور سے ان مضامین میں جہاں خواتین کو موضوع بنایا گیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گوڑ صاحب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی تقریر و تحریر میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ جس طرح بے تکلفی کے ساتھ وہ باتیں کرنے کے عادی ہیں اسی طرح ان کی تحریریں بھی بے ساختگی اور سادگی کا لطف رکھتی ہیں۔ ان کی گفتگو عموماً گہرے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے ان کی علمی یا ادبی نثر میں کسی

قسم کی ثقالت، ابہام یا پیچیدگی نہیں ہوتی۔ تخیل کی کارفرمائی ایسے مضامین میں نظر آتی جو کئی ہزار سال پہلے کے کسی ادب پارے سے متعلق ہوتی ہیں یا پھر کئی سو سال پہلے کسی تمدن و تہذیب کی خاص نہج پر مشتمل ہوں۔ جیسے" وادی گنگ و جمن میں زندگی ایسے ہی خراماں خراماں گزرتی جیسے گنگا کا دھارا۔" ایسے خوبصورت جملے اکثر نظر آجاتے ہیں۔ لیکن کہیں کے ساتھ۔ تحریر میں ہمواری ہے۔ اور اصطلاحات کا انبار نہیں ہے۔ خواتین پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کسی ایسی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا جو اکثر ہم سنتے رہے ہیں۔ اور جو گزشتہ کئی صدیوں میں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ وہ مسائل کو اپنے دور کی زبان میں اور اپنے مخصوص لب و لہجہ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے مضامین کی پیش کش یا تنظیم اکثر چونکا بھی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مضامین کو روایتی انداز پر لکھنے کے پابند نہیں ہیں۔ قصہ مختصر ان کے مضامین پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔"

حواشی

۱۔ ادبی تناظر ص ۱۵۷

۲۔ ادبی تناظر۔ ص ۴۴

۳۔ ادبی تناظر ص ۴۵

۴۔ ادبی مطالعے " انیس کی شاعری کا سماجی پس منظر۔

۵۔ " " " " " "

۶۔ ادبی مطالعے " " " ص ۹۶

۷۔ ادبی تناظر۔ "ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی" ص ۲۲

۸۔ شبلی کا سفرنامہ "یونان و مصر و روما"

۹۔ ادبی مطالعے "اقبال، ان کا ورثہ اور ان کی کوتاہیاں" ص ۹

۱۰۔ ادبی مطالعے مخدوم کی زندگی، مخدوم کی شاعری ص ۷۸، ۷۹

۱۱۔ ادبی تناظر "مولانا محمد علی جوہر" ص ۶۹

قمر جمالی

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: ایک شخصیت منشورِ مثلّث

حیدرآباد، فرخندہ بنیاد، ہمیشہ سے اپنی گنگا جمنی تہذیب کے لیے ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ یہ بات تعجب خیز تو ضرور ہے کہ وہ خطۂ زمین جس کا درحقیقت گنگ و جمن کے سنگم سے کوئی جغرافیائی علاقہ نہیں اور وہ تہذیب تو جس کی نمو شہنشاہ اکبر نے کی تھی، وہ اپنی اصلی جغرافیائی حدوں میں زندہ ہو کر نہ ہو ——— حیدرآباد کی فضاؤں میں ہواؤں میں، رودِ موسیٰ کے کنارے بسے قطب و مشتری کے لالہ زاروں میں، یہاں کی اونچی اونچی حویلیوں میں، اور ان کے زیرِ سایہ بسی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ——— نہ صرف زندہ بلکہ پائندہ ہے۔ حیدرآباد اپنے اس خصوص کے لیے یہاں کے باسیوں کے دل میں بسی محبت، 'سلیقۂ اظہارِ محبت'، اور اس اظہار کے لیے اس خوب صورت 'واسطے' کا مرہونِ منت ہے جسے ہم ایک نازک سی بیل تصور کریں جو اگرچہ کہ قرض دار کی طرح سارے معاشرے سے لپٹی ہوئی ہے، جس کے بیل ڈوروں میں رودِ موسیٰ کی مٹھاس، گنگ و جمن کی بولانی، بنارس کی پاکیزگی، لکھنؤ کا لوچ اور گداختگی، اودھ کی شائستگی، کشمیر کی موسیقیت اور دلّی کا کھری کھانٹ کھردرا پن، رنگ برنگی پھولوں کی طرح ایک دوسرے میں اس طرح گتھم گتھا ہیں کہ جیسے یہ سارے مختلف النوع گل بوٹے ایک ہی جڑ کی افزائش کا نتیجہ ہیں ——— اور یہ سچ بھی ہے کیوں کہ ان سارے گلوں کے رنگ کچھ ہوں ——— ڈھنگ کچھ ——— مگر ان کی خوشبو سے جو عطر بیز فضا بنتی ہے اس سے یہ تجزیہ کرنا ناممکن ہے کہ کس گل نے کیا حق ادا کیا۔ اسی عطر بیز فضا کا نام ہے ——— 'تہذیبِ دکن'!

ارضِ دکن کی اس عطر بیز فضا نے دنیا کو اپنے وقت کے مشہور دانشور، ادیب، شاعر، سخن ور اور سخن فہموں کا تحفہ دیا، ماقبلِ آزادی بھی ــــــ اور آزادی کے بعد بھی۔

میں اپنی دانست میں خود کو اس بات کی اہل نہیں سمجھتی کہ ابوالفضل فیضی یا شاہنامہ اسلام کی روشنی میں اپنے مضمون کا متن پیش کروں۔ ہاں مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اگر ہم حیدرآباد کی اس گنگا جمنی تہذیب کی تاریخ مرتب کریں تو اس صدی کے اوائل میں کچھ نام ہمیں ایسے جگمگاتے ملیں گے کہ جن کی روشنی میں ہم ہندوستان میں نشاۃِ ثانیہ کا تجزیہ کر سکیں گے۔ ایسے کچھ نام جنھیں حیدرآباد کا ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے وہ ہیں: راجہ کشن پرشاد، حبیب الرحمٰن، مولوی عبدالحق، آغا حیدر حسن مرزا، راجہ محبوب نرائن، ہارون خاں شروانی اور مخدوم محی الدین۔ جن کے بارے میں یوں کہا جاسکتا ہے ؎

ابھی پتوں پہ باقی ہیں جلے تنکوں کی تحریریں
یہ وہ تاریخ ہے بجلی گری تھی جب گلستاں پر (قمر جلالوی)

ہندوستان کی تہذیب ایک زندہ تہذیب ہے، ایسی تہذیب جو تغیر پذیر ہے ــــ زمان و مکاں کے حالات سے اثر قبول کرتی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ کیوں کہ ایسی ہی تہذیب میں ایک 'زندہ قوم' پنپ سکتی ہے، اور زندہ قومیں جلے تنکوں کی تحریروں کو مرتب کر کے واویلا نہیں مچاتیں، کہ تغیر 'نظامِ فطرت' ہے۔ جہاں ایک طاقت ناپید ہوئی کہ اس کی موزوں بدل ظہور میں آگئی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان ظہور میں آتی ہوئی طاقتوں کو محسوس کریں، اور اس کی شناخت اور سالمیت میں اپنا حق ادا کریں۔

اوپر میں نے جن ناموں کی زنجیر باندھی ہے، اسی کڑی کو اور آگے کھینچیں تو ایک نام اور ملے گا، اتنا ہی جانا پہچانا اور اتنا ہی باوقار ــــــ اور یہ نام ہے ــــ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ جنھیں ہم ارضِ دکن کی گنگا جمنی تہذیب کا 'نمک کا کنکر' کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا نام ہندوستان کے مہذب طبقے کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہے، بلکہ حیدرآباد کی تو شناخت ہے۔ ان کا شمار ہندوستان کی ان گنی چنی شخصیتوں میں کیا جاتا ہے جو اپنی پہلودار پہچان کی وجہ، اگر دکن کی تاریخ مرتب کریں تو اپنے تئیں ایک

باب کا اضافہ کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کے اس دور کی پود ہے جب ہندوستان انحطاط سے گزر رہا تھا۔ خون میں جوش اور جذبے میں سرفروشی تھی۔ شاید یہی بات ہے کہ اس دور کے جتنے بھی دانشور رہے وہ سارے کے سارے ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت ادیب بھی شاعر بھی، سیاسی مدبر بھی، ٹریڈ یونین لیڈر بھی۔ مزدور بھی اور استاد بھی۔ ڈاکٹر گوڑ کی شخصیت کو ہم اِن ہی خصوصیات کی بنا پر منشور مثلثی' کہہ سکتے ہیں ـــــ جو تین مختلف پہلوؤں سے رنگ و نور کی فضا باندھ رہی ہے۔ بحیثیت سیاسی مدبر، ٹریڈ یونین لیڈر اور ـــــ تنقیدی ادیب۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ارضِ دکن کی سُبک خرام، لچکیلی، چھبیلی رودِ موسٰی کے کنارے آباد محلہ گولی پورہ کے ایک کائستھ گھرانے میں جناب محبوب رائے گوڑ اور محترمہ امراؤتی گوڑ کے گھر ۲۱ جولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس گوشائیں گنج، فیض آباد، لکھنؤ سے ہجرت کر کے حیدرآباد آیا۔ اور یہیں بس گیا۔

ابتدائی تعلیم مفید الانام، دھرماونت، رفاہِ عام اور شاہ علی بنڈہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ مگر ساتویں جماعت میں انھوں نے اپنا ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی میں تبدیل کیا۔ اور چادرگھاٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں یہیں سے میٹرک امتیازی نشانات سے پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کیا، اور اسی سال ڈاکٹری کے لیے عثمانیہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں وہیں سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔

اپنے زمانہ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

> "میں اپنے تاریخ کے استاد سے بہت متاثر تھا جنھوں نے مجھ میں چھپے ادبی اور سیاسی رجحان کی نشاندہی کی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ میں پوری طرح ادب کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ اپنے تعلیمی وظیفے سے رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا کتب خانہ چلاتا تھا۔ مطالعے کے شوق میں میں گھنٹوں اسٹیٹ لائبریری میں بیٹھا رہتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی ادبی زندگی کی ترویج کے لیے میں استاد

دمشہور شاعر جناب صدق جائسی اور چچا جناب رائے محبوب نرائن گوڑ کا مرہون منت ہوں جنھوں نے مجھ میں شاعری اور ادب عالیہ کے مطالعے کا ذوق پیدا کیا۔"

۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۸ء کا دور حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کے لیے بڑا بدبخت ثابت ہوا۔ آندھرا پردیش خصوصاً حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں جاگیرداروں اور دیش مکھوں نے اپنی سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں۔ عام انسانوں کے سماجی حقوق ان مٹھی بھر جاگیرداروں اور دیش مکھوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس دور کے تمام طالب علم جو ذرا بھی حساس رہے ہوں اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لہٰذا راج بہادر گوڑ بھی جن کی ابھی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں، جو اپنی عمر کے اس دور سے گزر رہے تھے، جسے حیات کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے ــــ جب بساطِ ارض کی ہر شئے پر حسن وجمال کا تسلط نظر آتا ہے، جب فکرِ فردا سے دور سازِ زندگی کی ہر دھن مسرورکن محسوس ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔

بقول مخدوم ؎

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی سرودِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی تلک جھلا جھلاتے تھے غزلخواں حور ہوتی تھی

اس سرودِ سرمدی کے دور میں وہ شعوری طور پر سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ زمانۂ شباب ان کے لیے باعثِ تسکین نشاط تو کجا باعثِ احساسِ شباب بھی نہ ہو سکا۔ اگرچہ جوانی کا شعور عام انسانوں کی طرح ان کے ہاں بھی اتنا ہی جذباتی تھا جس کا ذکر عشق پر مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

"اٹھارہ بیس سال کا سن تھا، جوانی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ ایسے میں چاند چڑھتا ہے تو اس کے انداز اور ہوتے ہیں۔ دل میں طوفان امڈ آتا ہے چاند کی کرنیں مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں ـــــ تو عشق گنگنا اٹھتا ہے۔"

میں نے انھیں کے الفاظ دہراتے ہوئے ان کی اپنی جوانی کی کسی ہوشربا کہانی کے بارے میں

پوچھا کہ جب وہ اپنے خیالوں سے سرشار، کسی پری جمال کے ساتھ بادلوں پہ سوار فضا میں تیرتے رہے ہوں، اور پیار کی قوسِ قزح ان پر رنگ و نور کی برسات کرتی رہی ہو۔

"جوان ـــــ! ہاں جوان تو ہم ہوئے تھے۔ مگر کب ـــــ؟ اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔"

انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے

"اگر تو مجھے کچھ وقت دیتی ہے تو میں اپنی یادوں کو آواز دوں!"

ڈاکٹر گوڑ نے تو قہقہے کے بیچ اتنی گہری بات کہہ دی اور پہلے سے نارمل دکھائی دینے لگے، مگر وہ لمحہ میرے لیے باعثِ فکر رہا کہ جو انسان اپنی ذات میں انجمن رہا ہے، اس کی خلوت میں جلووں کا تصور بھی مختلف رہا ہوگا۔ خصوصاً جس کا بچپن ہی سن رسیدہ رہا ہو ـــــ دراصل ڈاکٹر راج بہادر اپنے بچپن ہی میں بزرگ رہے ہیں۔

بقول شخصے

بزرگی از عقل است، نہ سال
تونگری بہ دل است، نہ بہ مال

۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء میں جب ریاستی کانگریس نے جاگیردارانہ نظام کے خلاف عام سماجی حقوق کی بحالی کے لیے ستیہ گرہ کی تو راج بہادر گوڑ باضابطہ اس تنظیم میں شامل ہو گئے، مگر وہ ستیہ گرہ گاندھی جی کے حکم پر درمیان ہی سے اٹھالی گئی۔ جس سے نہ صرف راج بہادر گوڑ بلکہ تمام جوان نسل دل برداشتہ ہوگئی اور کسی اور تنظیم کی تشکیل کی منتظر رہنے لگی۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۳۹ء کے اواخر میں کامریڈس اسوسی ایشن کی داغ بیل پڑی۔ بس ڈاکٹر گوڑ کے ساتھ اس وقت کے کئی ہونہار طالب علم، مخدوم محی الدین، سید ابراہیم، مانک لال گپتا، احسن علی مرزا، ناگوراؤ، غلام حیدر، مرزا حیدر حسن، عاقل رضوی سری نواس لاہوٹی، جواد رضوی اور اونکار پرشاد، کامریڈس اسوسی ایشن سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء تک وہ باضابطہ سیاست میں داخل ہو چکے تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے سیاست کے ساتھ ٹریڈ یونین ازم میں قدم رکھا، اور اس وقت سے ان کی زندگی کے یہ دونوں رخ ایک دوسرے سے متصل یوں چلتے رہے کہ ان کو الگ کر کے دیکھنا خود ڈاکٹر گوڑ کو بانٹ دینا، یا پھر انھیں ادھورا دیکھنے کے مترادف ہوگا۔

۱۹۴۱ء میں وہ کامریڈس اسوسی ایشن کے باقاعدہ رکن بن گئے، اور ۱۹۴۲ء میں اس تنظیم کے معتمد عمومی اور ۱۹۴۳ء میں صدر چنے گئے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۶ء اور پھر ۱۹۶۲ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۶۹ء میں وہ ریاستی نائب معتمد۔ اس سے قبل ۱۹۶۴ء میں C.P.I کی ساتویں کانگریس میں پارٹی کے قومی کونسل کے لیے چنے گئے۔ ۱۹۶۵ء کو دسویں کانگریس وجے واڑہ میں سنٹرل ایگزیکیٹیو کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں C.P.I کی سنٹرل ٹریڈ یونین ڈپارٹمنٹ کے انچارج مقرر ہوئے ـــــ تو ۱۹۸۸ء تک اسی عہدے پر قائم رہے۔ ۱۹۸۹ء میں پارٹی کانگریس کلکتہ میں اپنے عہدے سے دستبردار ہو گئے۔

اگرچہ ٹریڈ یونین ازم سے ان کا تعلق ۱۹۴۰ء سے رہا، جب مابعد جنگ کی بڑھتی قیمتوں کے خلاف ریلوے مزدوروں نے ہڑتال شروع کی تھی۔ مگر حیدرآباد میں آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کی داغ بیل ۱۹۴۶ء میں پڑی اور ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کو جھرہ کمپونڈ سکندرآباد میں منعقدہ ایک جلسے میں مخدوم محی الدین کو صدر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو معتمد عمومی مقرر کیا گیا۔ اپنی ٹریڈ یونین ازم کے دوران سپننگ ملز مزدور یونین، ٹکسٹائل مزدور یونین، شاہ آباد سمنٹ مزدور یونین اور نہ جانے کتنی ہی مزدور یونینوں سے وابستہ رہے۔ آج بھی بحیثیت صدر

1. A.P.Land Development Bank Employees' Union
2. N.M.D.C. Staff Union
3. A.P. Govt. Press Employees' Union
4. IDPL Employees Union

سے وابستہ رہے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو جب ریاست گیر Anti Repression Day منایا گیا تو مخدوم محی الدین، جواد رضوی اور راج بہادر گوڑ کے خلاف وارنٹ جاری کر دیے گئے، اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عاید کردی گئی۔ اس وقت مخدوم محی الدین شاہ آباد میں تھے۔ جواد رضوی اور ڈاکٹر گوڑ اگرچہ روپوش ہو گئے تھے، مگر چوں کہ پہلی بار روپوش ہوئے تھے۔ زیادہ دن چھپے نہ رہ سکے۔ لہٰذا نومبر ۱۹۴۶ء کو دھر لیے گئے، اور حیدرآباد کی سنٹرل جیل میں محبوس کر دیے گئے۔

۱۷ مئی ۱۹۴۷ء کو جے پرکاش نرائن کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب کہ وہ کربلا میدان، سکندرآباد پر ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے والے تھے۔ تو شہر میں زبردست بدنظمی پھیل گئی۔ اس بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر گوڑ اور جواد رضوی جیل سے فرار ہوگئے۔ اور اس طرح روپوش رہ کر حکومت کے دانت کھٹے ہوگئے۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں حکومت نے ان کے خلاف ایک چال چلایا۔ اخباروں میں یہ جھوٹا اعلان کیا گیا کہ کامریڈ گووندو شراف، راوی نرائن ریڈی، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے خلاف وارنٹ منسوخ کردیے گئے ہیں۔ اگرچہ حکومت کی یہ چال بازی ان لوگوں کی سمجھ میں آگئی تھی، پھر بھی اس ناپاک پالیسی کا پردہ فاش کرنے کے لیے انھوں نے ایک چال چلی۔ حشمت گنج پر ایک میٹنگ بلائی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس میٹنگ کو ڈاکٹر گوڑ مخاطب کریں گے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر گوڑ سائیکل پر سوار جلسہ گاہ پہنچے مگر جوں ہی وہ جلسہ گاہ کے اندر داخل ہوئے پولس نے دروازے بند کرنے شروع کردیے۔ کامریڈ اس چال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے۔ انھوں نے ایک مزدور در کر راج ملیّا کو اپنے حلقے میں لیا اور 'راج بہادر —— زندہ باد' کے نعرے لگانے لگے۔ اس طرح پولس کو غلط راہ پر لگا کر ایک بار پھر وہ سلطان بازار کوٹھی کی راہ فرار ہوگئے۔ مگر ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو دیورکنڈہ تعلقہ کی راج کنڈہ پہاڑیوں پر گرفتار کرلیے گئے۔ پھر تو ۱۳ مئی ۱۹۵۲ء کو جب وہ راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے تو ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ایما پر رہا کیے گئے۔ ۱۹۵۶ء کو دوسری بار بھی راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے تو ختم میعاد تک قائم رہے۔

۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء کو انھوں نے اسمبلی چناؤ میں حصہ لیا، مگر دونوں ہی اوقات اپنے حریف کے آگے شکست کھائی۔ پہلی بار شاہ بنڈہ اسمبلی حلقے سے جناب صلاح الدین اویسی اور محترمہ معصومہ بیگم سے، اور دوسری مرتبہ سکندرآباد پارلیمانی حلقے سے شیو شنکر سے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست سے کوئی رشتہ استوار نہیں رکھا۔ اب تو بس ایک طرف ٹریڈ یونین ازم سے رشتہ رہ گیا ہے جو انشاءاللہ ان کی آخری سانس تک قائم رہے گا، تو —— دوسری طرف ادب سے —— جو لازوال رہے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ہمہ رخی شخصیت، بیک وقت تین خانوں میں بٹی ہے۔ جسے ہم تین پگڈنڈیاں متصور کر سکتے ہیں۔ سیاست، ٹریڈ یونین ازم اور ادب۔ مگر جہاں یہ تینوں پگڈنڈیاں ایک سرے پر آزادانہ طور پر ان کی حیات کی متوازی دوڑ رہی ہیں وہیں دوسرے سرے پر یہ ساری ایک پل سے منسلک ہیں ــــــ

اردو گوڑ صاحب کی مادری زبان بھی ہے، اور معشوقِ دلنواز بھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک کاستھ گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور اردو ان کی گھٹی میں پڑی ہے، بلکہ اس لیے کہ اردو زبان کی نازبرداریاں ڈاکٹر گوڑ کے زندہ رہنے کا ایک خوب صورت بہانہ ہے۔ یہاں میں اپنے ہی ایک مضمون "ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ــــ اور بہادر شاہ ظفر ایوارڈ برائے سال ۱۹۹۰ء" طبع شدہ روزنامہ سیاست مورخہ یکم اپریل ۱۹۹۱ء کے ایک فقرے کو دہرانا چاہوں گی ــــ "جس طرح انگریزی کے مشہور محقق و دانشور ڈاکٹر جانسن کو ان کی میلی کچیلی کنٹوپ، اور کھلے گریبان کے اوور کوٹ میں ملبوس، کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے رہنے کی وجہ انھیں

A Lion in the gun کہا گیا تھا، اسی طرح، آگے پیچھے، دائیں بائیں، کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو ہم ایک ایسے آبشار سے تعبیر کر سکتے ہیں جو نہایت اونچائی سے گر رہا ہے اور زمین پر قدِ آدم تک اطراف میں اپنی ٹھنڈک بکھیر رہا ہے۔"

دن کے بارہ گھنٹوں میں سے تقریباً نو گھنٹے بشرطیکہ انھیں کسی کام سے جانا نہ ہو، وہ یا تو کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں ــــ یا پھر لکھ رہے ہوتے ہیں۔ کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے، گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ننھے سے معصوم بچے کی مسکراہٹ لیے چمک دار آنکھوں سے وہ ہر آنے والے سے یوں ملتے ہیں جیسے وہ کسی انسان سے نہیں مل رہے بلکہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ باوجود ان کی فطری بذلہ سنجی کے ان کی عمیق نگاہوں کی آندھی ملنے والے کے پیر اکھاڑ دیتی ہے۔ ہاں مگر جو کبھی کسی کو انھوں نے اپنوں میں شامل کر لیا ہو تو بس ــــ ان کے اندر کا 'حیدرآبادی تہذیب کا نمک کا کنکر' راج بہادر، مشہور دانشور، ادیب و ناقد، سیاسی مدبر و ٹریڈ یونین لیڈر سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے ــــ اور اس وقت وہ صرف

ایک مشفق باپ، بزرگ ــــ یا پھر دوست رہ جاتے ہیں۔ ہاں مگر بات حق وانصاف کی ہو تو کھری کھری سناتے ہوئے وہ آؤ دیکھتے ہیں، نہ تاؤ ــــ حتیٰ کہ اگر کسی اجنبی کو ان کے اس موڈ میں شرف ملاقات حاصل ہو جائے، تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔

دو چار ٹانکے اور، لگے ہاتھ بخیہ گر
دامن بھی کچھ پھٹا ہے، گریباں کے ساتھ ساتھ (قمر جلالوی)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قد آور شخصیت اسم با مسمیٰ ہے۔ اونچا قد، تیکھے نقوش، چھریرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، قید و بند کی صعوبتیں سہنے کے باوجود، چہرے کی وہ بے داغ رنگت جسے دیکھ کر شمیم جے پوری کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

گیا نہ قید قفس میں بھی بانکپن اپنا
اسی طرح سے رہے جس طرح چمن میں رہے

سفید کرتا پاجامہ، یا پھر شیروانی، اور ہاتھ میں آبنوسی چھڑی میں ان کی شخصیت بڑی جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔ ادبی جائزے کے پبلشر جناب بشیر احمد صاحب نے انھیں جادو جگائی شخصیت کہا تو مجھے لگا کہ ڈاکٹر گوڑ کے سراپا کو سراہنے کے لیے اس سے موزوں اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی۔ باوجود اپنی بڑائی کا لوہا منوانے کے ان کی شخصیت میں ایک ایسی کشش ہے کہ سامنے والے کا دل موہ لیتی ہے۔ گھنٹوں ساتھ رہ کے نکل آؤ، تب بھی دامن دل کا ایک کنارہ وہیں کہیں اٹکا رہ جاتا ہے۔ اور یادوں کے کنج سے نکلا ایک ہلکا سا جھونکا بھی تار نفس کھینچنے لگتا ہے۔

بذلہ سنجی اور برجستہ کلامی ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ سادگی کا یہ عالم ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم ایک ایسے مرد مجاہد سے مل رہے ہیں جو ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بادشاہ وقت کے آگے صف آرا ہو گیا تھا۔ جس نے اپنی تنظیم و مقاصد کے حصول کے لیے مہینوں روپوشی کی تکالیف برداشت کیں، جیل کی صعوبتیں سہیں، جو مسلسل دس سال راجیہ سبھا کا ممبر رہا ہے، اور بحیثیت رکن اور سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے، نہ صرف ہندوستان کا چپہ چپہ صحرا نوردی کی ہے بلکہ دو تین مرتبہ سوویت یونین، بلغاریہ، منگولیا، چیکوسلواکیہ اور شمالی کوریا۔ جیسے ممالک میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

اردو زبان اور دکنی تہذیب سے ڈاکٹر گوڑ کا رشتہ مادری یا پدری ہو کہ نہ ہو عاشقانہ ضرور ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات جب بھی چلے جائیے۔ آپ انھیں اپنی محبوبہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر پائیں گے خواہ وہ کسی ادیب پر مضمون لکھ رہے ہوں کہ کسی کتاب پر تنقیدی مقالہ، کسی مزدور مسئلے کے سوزن گری ہو کہ انتظامیہ کے خلاف رپورٹ۔ حتیٰ کہ تفریح طبع کے لیے بھی فیض، حسرت، کیفی، مخدوم یا پھر غالب کی کشیدہ شراب دو آتشہ کو گھونٹ در گھونٹ نہیں بلکہ قدح در قدح پی رہے ہوتے ہیں۔ اردو ضرورت، اردو تفریح، اردو کھانا، اردو پینا اور یہاں تک کہ اردو اوڑھنا بچھونا ـــــ اردو سے والہانہ عشق ہی کا نتیجہ ہے کہ موجودہ نظام میں اردو کے ساتھ جو نا انصافیاں کی جا رہی ہیں۔ اسے وہ محض محسوس کرکے چپ نہیں رہ سکے، بلکہ انجام و عواقب کی پرواہ کیے بغیر انھوں نے اردو کے حقوق کی بحالی کے لیے اپنی آواز اونچی رکھی ـــــ اور بحیثیت رکن گجرال کمیشن، اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

ڈاکٹر گوڑ گو کہ تخلیقی ادیب نہیں ہیں مگر مختلف ادب پاروں اور مختلف رسالوں میں پھیلے ان کے بیسیوں مضامین ان کے اندر چھپے تخلیق کار کی چغلی کھاتے رہیں اور بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اینٹی فیوڈل وار Anti Fadual War کے اس مجاہد نے پتہ نہیں کیوں کوشش نہیں کی ورنہ میکسم گورکی کی ایک ایک کہانی حیدرآباد، ورنگل، ہنمکنڈہ، بڑودہ، بمبئی، بنگلور، جے پور اور چمیلی کا منڈوہ، کی دیواروں سے ضرور پیدا ہوتی۔

یہ محض اتفاق ہے یا وقت کی ضرورت کہ اردو کا بہت سارا انقلابی ادب نثری ہیئت میں ظہور پذیر ہوا۔ اگر ڈاکٹر گوڑ اس رجحان کی نثری طبع آزمائی کرتے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوتا، کیوں کہ اس خصوص میں یہ بات توطے رہی کہ ـــــ اگر ڈاکٹر گوڑ کہانی لکھتے تو ان کا کردار اپنی محبوبہ کے پہلو سے نکل کر یوں روپوش ہو جاتا کہ خود ڈاکٹر گوڑ نوکِ قلم سے پرت در پرت اسے کھوجتے رہتے ہوتے ـــــ اور۔ ۔ ۔ ایک نہ رکنے والا سلسلہ چل پڑتا جو زندگی سے تعبیر ہوتا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی پبلش کی ہوئی کتاب 'ادبی تناظر' کے حرفِ آغاز میں جناب خلیق انجم صاحب نے لکھا ـــــ "راج بہادر گوڑ نے پچھلے چند برسوں سے اردو لکھنا شروع کیا ہے۔ گویا وہ زندگی بھر پڑھتے رہے اور سنجیدگی سے لکھنا زندگی کے آخری دور میں شروع کیا۔"

بق انجم صاحب نے یقیناً بڑے پتے کی بات کہی ہے، مگر کچھ رد و بدل کے ساتھ کیوں کہ ڈاکٹر گوڑ تو
مدگی بھر لکھتے ہی رہے ہیں۔ اردو ہی میں نہیں انگریزی میں بھی۔ ہندوستان کے بیسیوں
سائل میں ان کے بے حساب مضامین گاہے گاہے چھپتے رہے۔ مگر انھیں اپنے قد کی بلندی
یلیم کروانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں ملی یا پھر انھوں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو
ئی ذات اور اصولوں کو بے حساب کتابوں میں قید کر کے اپنا وزن بڑھواتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ
میں اپنے مضامین کو کتابی شکل دینے یا پبلشرز کو یہ خیال ہنوز اب آرہا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں انجمن ترقی
ردو آندھرا پردیش حیدرآباد نے ادبی مطالعے کے نام سے ان کے (۱۳) مختلف مضامین کو ایک کتابی
کل دی، ۱۹۹۰ء میں دنیا پبلیکیشنز نئی دہلی نے ایک اور مجموعہ ادبی جائزے کے نام سے اجراء کیا،
ر ۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی نے (۱۸) تنقیدی مقالے اور تبصرے جو انھوں نے مختلف
تابوں پر لکھے، 'ادبی مناظر' کے نام سے مرتب کر کے جاری کیا۔ بدقسمتی سے ان مضامین کے
گے ان کی شان نزول اور تواریخ نہیں بتائی گئی، ورنہ کم از کم یہ اندازہ تو لگایا جا سکتا کہ کس موقع اور
ل سے متاثر ہو کر ڈاکٹر گوڑ نے کس شاعر، ادیب، یا پھر کتاب کو چنا اور اس پر مضمون لکھا۔ ہاں یہ بات
رور ہے کہ ان سارے مضامین میں وہ ایک ناقد کی طرح محض مشعل برداری نہیں کرتے بلکہ ایک
موش تماشائی کی طرح اپنے ہاتھ میں دوربین لیے روپوش ہیں اور وقفے وقفے سے دوربین کا رخ
ر گیج Gauge کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہلا ڈلا کر تا کا جھانکی کر رہے ہیں۔ وہ
پنی زبان سے کچھ نہیں کہتے چپ رہتے ہیں، ہاں آنکھیں دیکھتی ہیں اور قلم ان مناظر کو
رقم کرتا ہے۔

یہاں یہ بات ضرور کہنے کے لائق ہے کہ نظارہ کشی سے پہلے وہ اپنی 'وہ' عینک، ضرور چڑھا لیتے
ں۔ جس کا ایک شیشہ ہمدردی سے بنا ہے تو دوسرا خلوص سے۔ ان کے تنقیدی مقالوں میں ان کی
وشش بے حد ہمدردانہ رہتی ہے، کسی بے جگر ناقد کی طرح عامیانہ نہیں۔ اپنی رائے ادیبوں پر تھوپ
ر وہ خود کو ایک مستند ناقد ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ حق بات بھی منہ میں شکر رکھ کر
کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصرے ہندوستان کے سبھی ترقی پسند ناقدین کے ہم رتبہ
ں۔ جنھیں اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر گوڑ کے مضامین کی جو خاص رفت تماری کا ذہن ضبط کر لیتی ہے وہ ان کی زبان کی شگفتگی اور فطری بذلہ سنجی ہے۔ کسی بھی سنجیدہ بچویشن کو وہ اپنی طرز سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

مضمون بھارت چند کھنہ، کتاب ادبی مطالعے'

'حیدرآباد میں مخدوم کی سترویں سالگرہ منائی جارہی تھی۔ فروری کی رات، ہلکی ہلکی خوشگوار خنکی تھی۔ اردو ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مخدوم کی غزلیں اور نظمیں سنائی جارہی تھیں اور ان پر رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس پروگرام کے ایک صدر ستھے اور دوسرے صاحب مہمان خصوصی۔ میرے بازو میں ایک دراز ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ ـــــ شہ نشین پر فنکاروں کے پیچھے دو حضرات دم بخود بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ ـــــ آبنوس کے بنے ہوئے بزرگ کون ہیں؟ میں نے کہا میل سلاسی مرحوم کے ملک سے ابھی وارد ہوئے ہیں۔ انقلاب کے بعد زرعی اصلاحات کی وجہ سے کھانے پینے کو مل گیا ہے۔ اس لیے چہرے پر چکنائی آگئی ہے۔ آگیا گئی ہے ـــــ یہ کی چکنائی چہرے پر پھیل گئی ہے':

یہ نقاشی تھی جناب سعید بن نقش مرحوم کی۔ اسی مضمون میں ایک اور جگہ' خاموش غمگین، شرمسار، لاچار، آنکھوں میں نیند کا غلبہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، گالوں کی ہڈیاں اوپر کو ابھری ہوئی، بس ڈھانچے پر چمڑی مڑھ دی گئی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ کھانا جوڑ لیا ہے۔ یہ خرابی ہو رہی تھی جناب بھارت چند کھنہ صاحب کی۔

ایک اور مضمون" جیلانی بانو کی کہانیاں ـــــ میرے تاثرات"

"یہ ممکن تھا کہ جیلانی بانو نے اپنی نانی سے کہانی سن کر یہ تسلیم کر لیا ہو کہ راون کے دس سر تھے، اور وہ سیتا کو اڑن کھٹولے پر اڑا لے گیا تھا ـــــ لیکن یہی کہانی جیلانی بانو کی زبانی ان کی نواسی سنے گی تو بول اٹھے گی ـــــ گپ مت مارو نانی جان! کہیں کسی کے دس سر بھی ہوتے ہیں ـــــ جیلانی بانو کی نانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی تھی، اس وقت انسانی معلومات کا جو اوسط معیار تھا۔ ماحول جن مسائل سے پٹا

پڑا تھا۔ اور جن آرزوؤں کے سہارے انسانی کارواں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب جیلانی بانو کی نوا سیوں کے لیے اجنبی قدریں ہوں گی۔ اس وقت نئے مسائل ہوں گے نئے معیار ہوں گے، نئی آرزوئیں، نئی امیدیں ہوں گی، جن سے کہانی اپنا مواد اپنا کس بل حاصل کرے گی۔"

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اپنی ٹریڈ یونین سرگرمیوں، اور ادبی سرگرمیوں کے بعد اگر کسی سے محبت ہے ـــــ تو وہ ہے ـــــ مخدوم۔ مخدوم محی الدین سے دوستی اور محبت کا حق انھوں نے خوب ادا کیا۔ اپنے پہلے مجموعۂ مضامین 'ادبی مطالعے' میں منجملہ (۱۳) کے تین مضامین صرف مخدوم پر ہیں۔ اور دوسرا مجموعہ ادبی جائزے میں ایک، اور تیسرا مجموعہ 'ادبی تناظر' میں پھر ایک مضمون پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

مخدوم سے ان کے جذباتی لگاؤ کا وہ خود اپنے ایک مضمون 'مخدوم' میں اعتراف کرتے ہیں ـــــ "مخدوم سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی اور کن حالات میں ہوئی تھی، یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ مخدوم ہماری زندگی میں کچھ اس طرح بس گئے تھے کہ یہ یاد ہی نہیں آتا کہ ان کے بغیر بھی زندگی گزری۔ مخدوم کیا تھے؟ یوں لگتا تھا مقناطیس کی ایک لاٹ کھڑی ہے ـــــ بس کشش ہی کشش، ہمہ تن کشش۔"

ایک طرف تو ڈاکٹر گوڑ کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی ہے۔ آلام و مصائب سے پُر۔ دوسری طرف ان کی آسودگی کا یہ عالم کہ دار و رسن کے قصے بھی اتنے ہی چٹخارے لے کر سناتے ہیں گویا کہ آگ ان تک پہنچتے پہنچتے پھول بن جاتی ہے۔ بخدا یہ کوئی تلمیحی اشارہ نہیں۔ لہٰذا کفر عاید نہیں ہوتا۔ یا پھر بقول فیض . . .

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی، ہزار گزری ہے

یا پھر اقبال کے مطابق۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے مشق میں آبلہ پا کی مرہم پاشی کے لیے ہم خیال و ہم زبان ہم سفر کا ساتھ انھیں اس قدر مطمئن، قانع اور آسودہ رکھا ہے۔ یہ ساتھ ہے محترمہ برج رانی گوڑ صاحبہ کا، صبر و شکر کی پُتلی، ڈاکٹر گوڑ کی جیون ساتھی جنھیں بے حد پیار یا پھر بے حد پریکٹیکل انداز میں جب وہ بے حد تیزی سے 'برج رانی' پکارتے ہیں تو لگتا ہے 'بی جانی' ——— دکن کی سانولی ایثار و محبت کی مورتی، جو زندگی کے ہر موڑ پر قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی ہیں۔ لوہے کے گھروندے میں بھی اور مٹی کے سائبان تلے بھی۔ اور اب چنبیلی کے منڈوے تلے جہاں دو بدن جل تو رہے ہیں مگر پیار کی آگ میں نہیں انسان دوستی کی۔

لکھنا چاہوں تو یہ قصہ اتنا طول پکڑے کہ بحیثیت مضمون کسی رسالے میں کھپ نہ سکے۔ اس لیے یہ قصۂ ناتمام یہیں تمام کیے دینا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ ۔ ۔ ۔ ایک طرف تو ۔ ۔ ۔

ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے (غالب)

تو دوسری طرف:

اتر کر ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں دھرا کہ زمین چلنے لگی (شکیب جلالی)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی تحریریں

۱ ۔ خطبۂ صدارت بہار ریاستی اُردو کانفرنس، مظفرپور

۲ ۔ خطوطِ گوڑ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

خطبۂ صدارت

بہار ریاستی اردو کانفرنس

(مظفرپور۔ دسمبر ۲، ۳ر ۱۹۶۰ء)

پروفیسر سرور صاحب، صدر استقبالیہ، بزرگو اور دوستو۔

یہ ریاست بہار کے اردو دوستوں کی کرم فرمائی ہے کہ آج میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں اردو کا لکھنے والا نہیں صرف پڑھنے اور بولنے والا ہوں۔ اور ایک ایسی ممتاز مجلس میں جہاں بڑے بڑے بولنے والے اور ان سے بڑے لکھنے والے موجود ہوں میری یہ جسارت صرف اس لیے قابل معافی ہے کہ میں احباب بہار اور پروفیسر آل احمد سرور کی سازشوں کا شکار ہوں۔

ادھر کچھ برسوں سے دیس بھر میں زبانوں کا بہت چرچا ہے۔ ہر زبان آزاد ہندوستان میں اپنا مقام تلاش کر رہی ہے۔ صدیوں کی غلامی نے نہ صرف ہماری اقتصادی ترقی کی راہیں بند کر رکھی تھیں بلکہ ہماری زبانوں کے نشو نما کو بھی روک رکھا تھا۔ ہماری تہذیبی زندگی بھی پابند سلاسل تھی اور اس پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔

جب ملک آزاد ہوا تو ہمارے معاشی، اقتصادی ارمان انگڑائیاں لینے لگے اور نکبت و افلاس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کشمکش ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ ہمارے تہذیبی سوتے بھی جاگ گئے، ہماری زبانیں نئی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے لیے نئی راہیں ڈھونڈنے لگیں۔ زنجیریں اب ناقابل برداشت ہو گئیں۔ دریا بند نہیں رہ سکتا تھا۔ پھوٹ نکلا۔

لسانی صوبوں کی مانگ، نظم و نسق کی زبان کا سوال، ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ اور لسانی اقلیتوں کے مطالبات سب اسی وسیع اور محیط ملک ہلچل کا حصہ ہیں۔ یہ عوامی سوال ہیں اور عوامی نقطۂ نظر ہی سے انھیں حل کرنا ہے۔ یہ تہذیبی مسائل ہیں اور انھیں اسی انداز میں سیاسی اور فرقہ وارانہ گروہ

بندیوں سے اونچا اٹھ کر دیکھتا ہے۔

چنانچہ ملک بھر میں جہاں جہاں اُردو بولنے والے خاصی تعداد میں بستے ہیں وہ اُردو کے موقف اور مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں، کانفرنسیں کرتے ہیں، اس کے تہذیبی ورثے کا جائزہ لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خداوندانِ نظم و نسق کا اس کے ساتھ معاندانہ رویہ دیکھتے ہیں اور تشویش محسوس کرتے ہیں۔

ہم اُردو بولنے والوں کی دقتیں اس لیے بھی زیادہ ہیں کہ ملک میں کوئی علاقہ ایسا نہیں جو بلا شرکت غیرے اردو کا علاقہ قرار دیا جا سکے۔ حالانکہ مجموعی طور پر ملک بھر میں اس کے بولنے والوں کی تعداد کئی لسانی ریاستوں کی آبادی سے زیادہ ہے۔ مرہٹی، کنڑی، تلگو، تامل، ملیالم، بنگالی، گجراتی سبھی زبانیں بولنے والے اگر دوسرے مقامات پر اقلیت میں ہیں تو کم سے کم ان میں سے ہر ایک زبان کی ایک ایک ریاست بھی ہے جہاں اس کو بلا کم و کاست ترقی کے مواقع حاصل ہیں لیکن اُردو کا موقف یہ ہے کہ ہر جگہ اقلیت کی زبان ہے۔ کشمیر میں وہ سرکاری زبان تو ہے لیکن کشمیری عوام کی زبان کشمیری ہے اور جموں کے لوگ ڈوگری بولتے ہیں۔

اردو بولنے والے عوام قریب قریب ہر شہر میں موجود ہیں لیکن اصل میں اس کا وطن بھی یو۔پی اور بہار کا یہی وسیع و عریض علاقہ ہے جو ہندی کی جنم بھومی بھی ہے، اردو یہیں پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی، اس کی زمین یہی ہے، اس کی جڑیں یہیں ہیں۔

ذرا اردو کے عہد طفولیت کا جائزہ لیجیے۔ اس دور کا خیال کیجیے جب اردو پروان چڑھ رہی تھی بادشاہوں اور ان کے محدود نظم و نسق کی زبان فارسی تھی اور دیہاتی عوام اپنی اپنی بولیاں بولتے تھے۔ وادیٔ گنگ و جمن کی کوئی مشترکہ بولی نہیں تھی کہیں، ودھی بولی جاتی تھی تو کہیں برج بھاشا۔ کوئی کھڑی بولی سے کام نکالتا تھا تو کہیں بھوجپوری کا چلن تھا۔ کوئی مگدھی کا علاقہ تھا تو کوئی میتھلی کا۔ دربار کی زبان اور عوام کی بولیوں کے درمیان ایک خلیج تھی، ناقابلِ عبور۔

ایسے میں سماج بڑھتا رہا۔ سماج کی ضرورتیں بڑھتی رہیں۔ دو عوامل تھے جو ساتھ ساتھ سرگرم عمل تھے۔ دو دھارے تھے جو ساتھ ساتھ بہتے تھے۔ ایک تصوف کا دھارا تھا، دوسرا تجارت کا۔

صوفیوں کی ضرورت تھی کہ عوام سے ناطہ جوڑیں۔ انھوں نے دربار سے بغاوت کی تھی، دولت و ثروت سے منہ موڑ لیا تھا اور خدائی سے رجوع کیا تھا، انھیں عوام تک اپنا پیام پہنچانا تھا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دکن میں، نانک نے پنجاب میں، کبیر نے یو۔پی میں، اور

صوفیائے بہار شریف اور پھلواری شریف نے بہار میں اور دوسرے صوفیائے کرام نے اور مقامات پر ایک ہی بات کہی اور قریب قریب ایک ہی زبان میں کہی۔ اس لیے تعجب کا کوئی مقام نہیں کہ اُردو نثر کی پہلی کتاب آج سے پانچ سو سال پہلے ایک صوفی نے تصنیف کی اور یہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے۔

معراج العاشقین کی زبان کا تجزیہ کیجیے۔ یا حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے کلام کا۔ یا صوفیائے بہار کی تخلیقات کا آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ ان کی زمین ایک ہی ہے۔ ان کی بنیاد میں اسی بولی بہار کے علاقے ہیں کہیں برج یا اودھی کی جھلک ملے گی تو کہیں ہریانوی کی، کہیں گنہ ھی کی۔

صوفیائے کرام نے تصوف کے پرچار کے لیے یا پھر مخصوص بیماریوں کی دواؤں کو بتلانے کے لیے شاعری سے کام لیا۔ حضرت مخدوم بہاری نے بہار والوں کو آنکھ کا علاج بتلایا۔———

لودھ، پھٹکری، مردار سنگ
ہلدی، زیرہ، ایک ایک تنک
افیون چنا بھر، مرچیں چار
اور پھر موتھا اس میں ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے
نیناں پیرا پل میں ہرے

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دکن نواسیوں کو دانتوں کی دوا بتلائی۔

زیرہ، مرچاں، سوُر، سونٹھ
کتھا جلا کر گھونٹ
نیلا تھوتھا، دھنیا بھون
اس میں ملا تو سیندھا لون
پان پلاس کی کا نٹھیاں آن
جا پھل، لونگ اور لوبھان
جوں جوں لگاوے پاوے سکھ
تجھ دانتوں کا جاوے دُکھ

حضرت مخدوم بہاری کے جانشین حضرت بلخی نے فرمایا———

جی مگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں
جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی گتیاں

اور خواجہ بندہ نواز نے دکن میں کہا ــــــــ
پانی میں نمک ڈال لیاں، دیکھنا اسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
دیا گھول خودی اپنے خدا ساتھ مصطفےٰ
جب گھل گئی خودی تو خدا بولنا کسے

کلام کے یہ نمونے آپ کے سامنے ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام کی تخلیقات کے بعد سولھویں اور سترھویں صدی تک ریختہ گو شعرا کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔ قلی قطب شاہ کی مشہور غزل " پیا باج پیالہ پیا جائے نا۔" سے آپ واقف ہیں، اور یہ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے، جو سولھویں صدی میں گذرا ہے۔ غواصی اور وجہی نے اسی زمانہ میں شاعری کی۔ سترھویں صدی میں تانا شاہ کے دربار کا ایک شاعر کہتا ہے۔

ملنا تمن کا خبر ہے کوئی جھٹ کوئی سچ کہتے:
کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچ کہتے کوئی کچ کہتے

اسی زمانہ میں بہار کا شاعر بیدل جب پٹنہ چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے تو اپنی دیہاتی منہ بولی ماں کے پاس جا کر کہتا ہے۔

سر اوپر جب کوئی نہیں تب دشمن اپن کیس
پٹنہ نگری چھاڑ دین اب بیدل چلے بدیس

بہار کا ایک اور شاعر قاضی عبدالغفار کہتا ہے۔

تن کا تانبا آگ موں پانی کرے جو دے
ڈارے بوٹی پریم کی تب جا کنچن ہوئے

غرض پندرھویں عیسوی سے لے کر سترھویں صدی کے ختم، اٹھارھویں صدی کی ابتدا تک ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام ہوں کہ صوفی منش شعرا دہلی میں، لکھنؤ میں، بہار میں، دکن میں غرض جہاں بھی وہ تھے ایک مقامی ریختہ کی تخلیق کر رہے تھے۔

قریب قریب اسی زمانہ میں ہماری سماج پر دیہی معیشت کی فضا تنگ ہو رہی تھی۔ تجارت

شروع ہو چکی تھی۔ بازار بھرنے لگے تھے۔ اور منڈیاں لگنے لگی تھیں۔ شہروں کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ بہار اور یوپی کے علاقوں ہی میں، پٹنہ، بنارس، الٰہ آباد، لکھنؤ، میرٹھ، آگرہ جیسے شہر ابھرنے لگے۔ دلی راجدھانی تھی۔ ان سب کا راجدھانی سے علاقہ لازمی تھا۔ سڑکیں بننے لگیں جو ان شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتی تھیں۔ وہی ریختائیں جو ان شہروں میں پیدا ہو رہی تھیں اب ایک معیاری زبان کا روپ دھارنے لگیں جو ان شہروں میں یکساں طور پر بولی جاتی تھی باوجودیکہ ان میں سے ہر شہر کے اطراف ایک بڑا دیہی علاقہ تھا جس کی اپنی الگ بولی تھی۔ پٹنہ کے اطراف مگدھی تھی تو بنارس بھوجپوری علاقہ میں واقع تھا۔ آگرہ برج کے علاقے کا شہر تھا تو لکھنؤ اودھی علاقے کا۔ یہ معیاری زبان دہلی کے اطراف واکناف کی کھڑی بولی تھی اور یہی اردو تھی۔

اس لحاظ سے عصری اردو اور عصری ہندی دونوں کی زمین ایک ہی ہے اور دونوں کا لوک آدھار ایک ہی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک لوک آدھار ہوتا ہے [illegible] ہوتا ہے اور زبان اپنا مزاج، اپنے الفاظ کا بیشتر ذخیرہ اسی لوک آدھار سے حاصل کرتی ہے۔ ہندستان کی ہر قومی زبان کا اپنے علاقے میں ایک لوک آدھار ہے۔ اسی طرح عصری اردو اور عصری ہندی دونوں کا لوک آدھار اسی وادیٔ گنگ و جمن میں ہے۔ اسی لیے ادبی اسالیب کے تنوع کے باوجود دونوں کی قواعد ایک ہے اور دونوں کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ مشترک ہے۔

کچھ نادان حضرات یہ کہتے ہیں کہ اردو پر فارسی اور عربی جیسی بدیسی زبانوں کی چھاپ ہے اسی لیے اس کا مزاج بدیسی ہے، اس کے برخلاف ہندی، سنسکرت سے فیضان حاصل کرتی ہے اسی لیے وہ ٹھیٹ ہندوستانی ہے۔

مجھے اس استدلال سے سخت اختلاف ہے۔ اگر ملکی غیر ملکی کی بات کرنی ہے تو پھر سنسکرت بھی غیر ملکی زبان ہے کیونکہ یہ بھی تاریخ کے کسی دور میں سہی باہر ہی سے ہندوستان آئی ہے، لیکن میں اس طرز بحث کو معقول نہیں سمجھتا۔ بہت سی ہندوستانی زبانوں کی طرح ہندی بھی انڈو آرین زبان ہے اور اردو بھی۔ بنگالی بھی ہند آریائی زبان ہے اور مرہٹی بھی۔ اور ہندوستان کی کون سی زبان ہے جس کی سنسکرت سے چشمک نہیں رہی ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں پراکرت اور اس سے پہلے سنسکرت اس علاقہ کی سرکاری زبان رہی ہے جو تلگو کا علاقہ کہلاتا ہے۔ پھر تلگو زبان میں ترجمے کیے گئے اور ادب منتقل ہوا۔ تلگو نظم و نثر کی تخلیق ہونے لگی اور پھر تلگو بھی سرکاری زبان بنی۔ ایک بڑی تحریک تلگو کو سنسکرت کے اثر سے پاک کرنے اور کھری تلگو بولنے کی تاریخ میں چل چکی ہے۔ یہی بات اور زبانوں پر بھی صادق آتی ہے

اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر زبان میں "تت سم" (یعنی سنسکرت کے وہ الفاظ جو جوں کے توں استعمال ہوتے ہیں) اور "تدبھو" (یعنی سنسکرت کے الفاظ اپنی بدلی ہوئی شکل میں) الفاظ ملتے ہیں۔ کہیں "تت سم" زیادہ ہیں تو کسی زبان کی ساخت میں "تدبھو" الفاظ کی فراوانی ہے خود عصری اردو میں کئی "تت سم" الفاظ ہیں۔ اور عصری ہندی کا یہ رجحان کہ اس میں "تت سم" الفاظ اور سنسکرت مشتقات ٹھونس دیے جائیں کوئی عام پسند رجحان نہیں ہے۔ اس کی مخالفت بڑھ رہی ہے، اس کی وجہ سے عصری ہندی اپنے لوک آدھار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

اسی قسم کا ایک تجربہ اُردو کے تعلق سے جامعہ عثمانیہ میں ہو چکا ہے۔ اردو زبان میں فارسی اور عربی الفاظ ٹھونس کر اسے ایک ایسی جناتی زبان بنا دیا گیا تھا جو عام انسان کی فہم سے بلند ہو گئی تھی۔ الفاظ فارسی ہوں کہ عربی، سنسکرت ہوں کہ انگریزی، محض لسانی عصبیت کی بنا پر نہیں ٹھکرائے جا سکتے۔ زبان کے مزاج سے اگر وہ مطابقت رکھتے ہوں تو کھپ جائیں گے ورنہ متروک ہو جائیں گے یا پھر ان میں تبدیلی پیدا کر کے انھیں زبان کے مطابق ڈھال لیا جائے گا۔ یہی اُردو کے معمار شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہے، نظیر نے کئی الفاظ وضع کیے اور انھیں شعر میں نگینہ کی طرح جڑ دیا۔ غالب نے ع "مجھے ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا" کہہ کر انگریزی لفظ "نمبر" کی تھینڈ کر ڈالی۔

آپ جانتے ہیں کہ عربی میں "نقد" کے معنے "پرکھ" کے ہیں۔ لیکن بول چال کی اُردو میں اس کا مطلب بدل گیا اور وہ کیش Cash کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ زبان عوامی بول چال کی ٹکسال میں ڈھل کر ہی زبان بنتی ہے اور عوام الفاظ کے برتنے میں تعصب سے نہیں فراخدلی سے کام لیتے ہیں۔

پھر فارسی الفاظ عصری ہندی میں بھی تو کثرت سے ملتے ہیں۔ اور کس زبان میں نہیں ملتے۔؟ بنگالی میں، اڑیہ میں، مرہٹی میں، گجراتی اور راجستھانی میں سبھی زبانوں میں فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ مرہٹی، گجراتی اور پنجابی زبانوں میں تو فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگریزی جسے اتنے زیادہ لوگ پڑھتے اور بولتے ہیں اور جو آج بھی ہماری سرکاری زبان ہے، اس نے ہماری قومی زبانوں کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ فارسی نے کیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ فارسی بھی ایک آریائی زبان ہے اور ہماری پڑوسن ہے۔ قدیم فارسی اور سنسکرت تو بہنیں ہی ہیں۔ اس لیے کئی ایسے الفاظ جو ہماری زبانوں کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں ہماری بول چال میں آ گئے۔ اب وہ اجنبی نہیں رہے۔

پھر بھی ہم اُردو کے بولنے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ فارسی اور عربی الفاظ ٹھونس کر ہم اپنی

زبان کو اس کے اپنے لوک آدرشوں سے دور نہ ہونے دیں۔ فارسی زبان سے کینہ نہیں لیکن ان کا بے جا استعمال بھی جائز نہیں۔ ہمارے اچھے شاعروں نے ہمارے لیے یہی نقش چھوڑے ہیں۔ مثلاً قلی قطب شاہ نے کہا۔

قطب شاہ نہ دو مجھ دِوانے کو پند
دِوانے کو کچھ پند دیا جائے نا۔

یہاں فارسی کا لفظ 'پند' اس خوبی سے استعمال ہوا ہے کہ کانوں پر گراں نہیں گزرتا۔

انیس نے کہا ع "شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے" اور یہ بھی کہا۔ ع "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" "شبنم" فارسی ہے مگر نہایت موزوں۔ 'اوس' ہندی ہے اور نگینہ کی طرح جڑا ہوا۔

میر نے فرمایا۔

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یہاں 'گل' بھی ہے اور 'باغ' بھی اور 'حال' بھی۔ یہ سب فارسی الفاظ ہیں لیکن اجنبی نہیں لگتے۔

اُردو پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اُردو نے اپنے ادبی اسالیب، اپنے استعارے، تشبیہات و تلمیحات سب فارسی سے حاصل کیے ہیں، جو اسے اجنبی بنا دیتے ہیں۔

یہ اعتراض بھی نہ صرف غیر صحیح ہے بلکہ یہ بھی لسانی عصبیت اور زبان کے ارتقاء کے طور طریقوں سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ عصری انگریزی پر لاطینی اور فرنچ زبانوں کا بہت اثر ہے۔ کئی ادبی اصطلاحیں، کئی تشبیہات اور تلمیحات انگریزی نے ان "بدیسی" زبانوں سے حاصل کیے ہیں لیکن ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اسی طرح زبانیں ترقی کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے فیضیاب ہوتی ہیں اور ان کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے۔

اُردو نے صرف "عدل نوشیرواں" اور "جام جمشید" ہی کو تو نہیں نظم کیا ہے بلکہ "صبح بنارس"، "شام اودھ"، "شب مالوہ"، "سحر بنگال" اور "زلف بنگال" کو بھی ابدی قدریں بخشی ہیں۔ یہ سب ہندوستانی تہذیب سے ماخوذ ہیں کہ بدیسی درآمدات ہیں؟

رانی کیتکی اور اودے بھان کی کہانی اردو کے ادیب انشا نے لکھی۔ راجہ رام اور کنول دی کے عشق کو بہار کے ایک شاعر شاہ آیت اللہ جوہری نے نظم کیا ہے۔ شیریں فرہاد، اور لیلیٰ مجنوں کے

ساتھ نل دمینتی بھی اُردو ادب کے رومانی افق پر درخشاں نظر آتے ہیں۔ ہیر رانجھا اور مرزا صاحبان ہندوستانی تھے ایرانی نہیں۔ غلام نقشبند بہار کا اٹھارویں صدی کا شاعر جب یہ کہتا ہے کہ ۔۔۔۔

پرویز و نل و کوہ کن و وامق و مجنوں

جو ہے وہ میری بات کی تقلید کرے ہے

تو وہ نل کو قیس و فرہاد سے الگ اور اجنبی نہیں مانتا۔ جب نظیرؔ عالم وجد میں بول اُٹھتا ہے۔

"اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کرشن کنھیا کی"

تو معتقدین کے سر احترام سے جھک جاتے ہیں۔ جب ہم نیلے نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں اور ناچتے ہوئے ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دیکھتے ہیں تو "نیل تن کرشن کے پہلو میں مچلتی گوپیاں" یاد آجاتی ہیں۔

اردو نے اپنے ادبی خزانے کو ہندوستانی تہذیبی قدروں سے مالا مال کیا ہے۔ ہندوستانی صبح وشام، ہندوستانی دریا اور پہاڑ، ہندوستانی تہوار اور میلے سب پر اُردو شاعروں اور ادیبوں نے لکھا ہے۔ خوبانِ ہند کا حسن، ان کے حسن کا نور، ان کے زلفوں کی مہک، ان کی درخشاں جبیں پر سرخ ٹیکے کی دمک، سبھی سے اُردو شاعروں نے انسپریشن لیا ہے۔ اردو پر یہ اعتراض بھی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

دوسرے یہ کہ اُردو نے بعض اصناف ادب فارسی سے حاصل کیے ہیں تو بعض اسلوب ہندی سے بھی لیے ہیں۔ اردو میں اگر غزل ہے تو دوہے بھی ہیں۔ قصیدے ہیں تو گیت بھی ہیں۔ بلکہ اردو کی لچک کا اندازہ بھی ان ہی اصنافِ سخن کے تنوع سے ہوتا ہے۔ اور یہی نہیں ریڈیو کی ایجاد کے بعد ڈرامے کی ایک نئی صنف کی ضرورت لاحق ہوئی جس میں اداکاری کی گنجائش نہ تھی محض مکالموں اور ان کے اداکرنے کے انداز کی اہمیت ہے۔ اس میدان میں بھی اردو نے اپنا سکہ جمایا۔ مختصر افسانے، رپورتاژ، نظم معرا، غرض کئی اصنافِ ادب کو اردو کے ادیبوں نے خوب ترقی دی۔

کچھ کرم فرما ارشاد فرماتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور تقسیم ہند کے بعد اسے پاکستان الاٹ ہوگیا۔

اردو نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ سب مسلمانوں کی۔ بنگال میں، مدراس میں، کیرا میں، آندھرا پردیش میں، میسور میں، مہاراشٹر میں اور گجرات میں ایسے کئی مسلمان گھرانے ملیں گے جو نہ صرف اردو کا ایک لفظ نہیں جانتے بلکہ جن کی مادری زبان بنگالی، تامل، ملیالم، تلگو، کنڑی، مرہٹی،

یا گجراتی ہے۔ اس کے برخلاف اتر پردیش اور بہار میں کئی غیر مسلم ایسے بستے ہیں جن کی زبان اردو ہے۔ پھر اردو زبان کی تعمیر میں کئی غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کا حصہ ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور پاکستان میں اگر بعض ارباب کرم اردو کو زبان کیا، رکن ایمان بھی سمجھیں تو بھی بہر حالت میں اردو ان ہی حضرات کی مادری زبان ہوگی جو ہندوستان سے پاکستان گئے ہیں ورنہ وہاں کے عوام کی زبان تو سندھی، بلوچی، پشتو، پنجابی، اور بنگالی ہی ہے، پاکستان میں اردو کو وہ لوک آدھار کہاں نصیب ہے جو اسے یو۔پی اور بہار میں میسر ہے۔ اردو کی نوعیت وہاں جڑ سے بے کار ان کی سی ہے۔

اردو بہرحال ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیادیں یہیں ہیں۔ اس کا لوک آدھار یہیں ہے۔ اس کے وسیع بولنے والے یہیں رہتے بستے ہیں اور وہ ان کی مادری زبان ہے۔ اسی لیے انجمن ترقی اردو ہند اور ہندوستان بھر میں اردو بولنے والوں کو یو۔پی اور بہار میں اردو کے موقف اور مستقبل کے بارے میں گہری تشویش لاحق ہے۔

اردو کو آزاد ہندوستان کے آئین میں ایک قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن خود اس کے اپنے علاقے میں اسے جو جائز مقام ملنا چاہیے ابھی تک نہیں ملا۔ اس معاملہ میں بہار والے شاید خوش قسمت ہیں۔ اصل دقتوں کا سامنا تو اتر پردیش میں کرنا ہے۔ بہار اور یو۔پی کے حالات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ یو۔پی میں اردو کی جان بوجھ کر اور فرقہ وارانہ زاویوں سے مخالفت کی جاتی ہے اور ہندی بمقابلہ کو اردو بولنے والوں کے خلاف صف آرا کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ریاست بہار میں اردو بولنے والوں اور ہندی بولنے والوں کے درمیان صحت مند اور بھائی چارہ کے روابط ہیں۔ یہاں بہت سے ہندی پریمی اردو کی اہمیت اور حیثیت کو مانتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ یو۔پی، اور بہار میں اردو کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ان ریاستوں کے تعلیمی نظام میں اور نظم و نسق کے ڈھانچے میں موزوں مقام ملے۔ تحتانی درجوں میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہی ہو، یہ تو آئین نے تسلیم کر لیا ہے۔ ثانوی درجوں میں ذریعۂ تعلیم کیا ہو، اس پر ہندوستان کی سبھی ریاستوں کے وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں غور کیا گیا تھا جو ۱۹۴۹ء میں مولانا آزاد مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی، اس کانفرنس نے فیصلہ کیا تھا کہ ثانوی منزل پر بھی اگر کسی علاقہ میں ایسے طالب علموں کی معقول تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان علاقائی یا ریاستی زبان سے مختلف ہو تو ان کے لیے الگ ثانوی تعلیم کا بندوبست ہوگا جہاں ذریعۂ تعلیم اقلیتی زبان ہوگی۔ ریاستی تنظیم جدید کمیشن نے ۱۹۵۶ء میں رائے دی کہ تحتانی تعلیم کی

نوعیت الگ الگ ہے ثانوی تعلیم کے لیے آئین میں ذکر ضروری نہیں، البتہ حکومت ہند تفصیلات کا تعین کرسکتی ہے۔

اب حکومت کا اور تعلیمی بورڈ کا یہ فیصلہ ہے کہ اقلیتی زبانوں میں ثانوی تعلیم کا بندوبست اقلیتیں خود کرلیں، سرکاریں امداد دیں گی، مگر وہ خود اس کی ذمّہ داری نہیں لے سکتیں۔ یہ فیصلہ ظاہر ہے ۱۹۴۹ء میں وزرائے تعلیم کے فیصلہ کے برعکس ہے۔

آج کل مہاراشٹر میں بھی قاضی اسکیم پر جو بحث چل رہی ہے اس کی بھی بنیاد یہی ہے۔ قاضی اسکیم کے مطابق اعلیٰ ثانوی مدارس میں ذریعۂ تعلیم مراٹھی ہوگی اور اردو محض ایک زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی۔

میری ناقص رائے میں انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۹ء کے فیصلوں پر قائم رہے اور حکومت ہند سے مطالبہ کرے کہ اس پر عمل ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض کہ اقلیتی زبان بولنے والے طلبا ریاستی زبان بولنے والے طلبا کے مقابلہ میں ریاستی زبان میں کمزور ہوں گے اور اس طرح سرکاری نوکریوں کے حاصل کرنے میں انھیں دقت ہوگی، معقول نہیں۔ سرکاری نوکریوں کے لیے یا پبلک سروس کمیشن کے یا دوسرے محکمہ جاتی امتحانات کے لیے سرکاری زبان خواہ ہندی ہو یا کوئی اور اس سے صرف اتنی واقفیت کافی ہے کہ کام چلایا جاسکے۔ اقلیتی زبان بولنے والے امیدواروں سے مہارت کا مطالبہ کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ اور جب اقلیتی زبان بولنے والا طالب علم تیسرے درجہ ہی سے ریاستی زبان سیکھنے لگے گا تو اعلیٰ ثانوی تعلیم ختم کرنے تک یہ تو امید کی جاسکتی ہے کہ اسے ریاستی زبان سے اتنی واقفیت ضرور ہو جائے گی کہ کام چلایا جاسکے۔ یو۔ ڈی۔ سی اور اس سے اونچی نوکریوں کے لیے تو جامعاتی ڈگری لازمی ہے۔

اس کے علاوہ نظم و نسق میں بھی مخصوص اغراض کے لیے اقلیتی زبان کو اس کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے مناسب مقام ملنا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو ہند نے اس ضمن میں معقول تجویزیں رکھی ہیں۔ اصولاً تو ان باتوں کو مان لیا گیا ہے کہ خاص خاص علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد ہے، سرکاری اعلانات اردو میں بھی شائع کیے جائیں گے۔ بعض اہم قوانین بھی اردو میں چھاپے جائیں گے۔ سرکار کو بھی بہرحال عوام کے لیے چلانا ہے کوئی وجہ نہیں کہ خود سرکاری لٹریچر عوام کو اپنی زبان میں نہ پہنچایا جائے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ یو۔پی، بہار کے علاقہ میں کم سے کم ایک اردو یونیورسٹی ہو اور دوسری یونیورسٹیوں میں اردو کو بہ حیثیت ایک مضمون کے پڑھایا جانے کا معقول انتظام ہو۔

میں پورے خلوص کے ساتھ یہ تجویز رکھوں گا کہ یو۔ پی اور بہار میں وہ طلبا جن کا ذریعۂ تعلیم ہندی ہے وہ بھی اردو ضرور پڑھیں ان مدرسوں میں کم سے کم اختیاری زبان کی حیثیت سے اُردو پڑھائی جائے۔

میری یہ غور کردہ رائے ہے کہ اردو پڑھنے اور سیکھنے سے ہندی خود بھی ترقی کرے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اُردو پڑھنے والے لڑکے، لڑکیاں ہندی لازمی سیکھ رہی ہیں اور ہندی پڑھنے لکھنے سے ان کی اُردو میں اور نکھار آئے گا۔

میں پھر اس بات پر زور دوں گا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا لوک آدھار ایک ہی ہے۔ دونوں کے الفاظ کا مشترکہ ذخیرہ وسیع ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے فیضیاب ہوتا ہے۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ازدواجی رشتہ ٹوٹ سکتا ہے لیکن بہنوں کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ رشتہ ماں کی کوکھ میں ڈھلا ہے اور اس کے دودھ سے استوار ہوا ہے۔

ہندی کے بعض کرم فرما اردو کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں لیکن ہندی پڑھنے اور بولنے والے وسیع عوام اس عصبیت سے دور ہیں۔ اسی لیے تو آپ دیکھتے ہیں کہ غالب کے ہندی نسخے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر فروخت ہوتے ہیں۔ اُردو کے افسانہ نگار، اُردو کے شاعر اور اردو کے ادیب ہندی رسالوں میں خوب چھپتے ہیں اور ان کی تخلیقات بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ ہمیں ان صحت مند تعلقات کو اور بھی استوار کرنا ہے۔ ہماری کانفرنسوں، ادبی محفلوں اور تہذیبی سرگرمیوں کو اس مقصد کی تکمیل کا آلہ بنانا ہے۔

حضرات! میں نے آپ کا بہت قیمتی وقت لیا۔ آخر میں آپ سب کا اور منتظمین کانفرنس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے یہ عزت بخشی کہ آپ کی محفل میں شریک ہو سکوں۔

خطوط ـــــ راج بہادر گوڑ

بنام : صالحہ عابد حسین

۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء

محترمہ صالحہ بیگم صاحبہ

آداب عرض ہے

آپ کی کتاب "گوری سوئے سیج پر" پر میں نے تبصرہ کیا ہے۔ "ہماری زبان" میں کتابت کی غلطیوں نے اس کا بھرکس نکال دیا۔

۳ ستمبر کے روز نامہ سیاست (حیدر آباد) میں بھی شایع ہوا ہے۔

۱۰ ستمبر کے ماہنامہ "کمیونسٹ جائزہ" میں بھی شایع ہوا ہے۔ میں نے یہ آخرالذکر شمارہ ذریعہ ڈاک آپ کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔

آپ مجھ سے شخصی طور پر شاید واقف نہیں۔ کبھی بات چیت کا موقع نہیں ملا۔ ویسے میں آپ کو دور سے البتہ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی تصنیفات تو خیر دیکھتا ہی رہتا ہوں۔ اور کچھ تو میرے کتب خانے کی زینت بھی ہیں۔

البتہ عابد حسین صاحب مرحوم سے اچھی خاصی ملاقاتیں رہی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بھی اور یوں بھی۔ مرحوم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور ان کا کرم میرے لیے ہمیشہ سرمایۂ حیات رہے گا۔

انشاءاللہ چنڈی گڑھ میں انجمن کے جلسوں میں ملاقات ہوگی۔

نیاز مند
راج بہادر گوڑ

بنام : پروفیسر جگن ناتھ آزاد

حیدرآباد

۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ء

مکرمی ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بہت ممنون ہوں۔

'آنکھیں ترستیاں ہیں' تو میں نے شروع سے آخر تک عرصہ ہوا پڑھ ڈالی۔ اس پر لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر صاحب اس میں حضرت کاتب نے وہی کمال دکھائے جو کاتب ازلی نے آپ کی 'کتابت' کے وقت دکھایا تھا۔ پنجابی تو بنایا لیکن گیسو دراز نہیں بنایا۔ اگر یہ ہوجاتا تو بادہ خواری کے باوجود آپ کا شمار صوفیوں میں ہوتا۔

'اقبال' پر آپ کی کتاب آج کل میں آجائے گی۔ انشاءاللہ آپ کو گلہ نہیں رہے گا۔

ادھر کیفی نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ — دوسرا اجلاس" نظم کہی ہے۔ اس پر تبصرہ غالباً ۲۳ ستمبر کے 'حیات' میں شائع ہوگا۔ آپ کی رائے چاہوں گا۔ یہاں آپ سے معذرت کا طلب گار بھی ہوں۔ آپ نے 'اقبال اور مغربی مفکرین' کتاب میں 'اقبال اور دانتے' اپنے مقالے میں اقبال کے جس ابلیس کا تصور پیش کیا ہے وہ دانتے سے مختلف تو ہے ہی لیکن وہ اُس ابلیس سے بھی مختلف ہے جو اقبال کی اردو نظموں سے ابھرتا ہے۔ یہاں وہ انسان کو راہِ مستقیم سے بھٹکانے والا ہے اور اقبال ابلیس سے کہلوانے میں نظام ابلیس کا اصل دشمن مسلمان ہے۔ یہاں بھی مومن کا اُن کا تصور بہت وسیع ہے۔ وہ جس میں آفاق گم ہوں۔ کہیں وہ 'مومن' جن کا اقبال خواب دیکھ رہے تھے آپ اور ہم تو نہیں۔

دہلی جانے کے بعد آپ کے تاشقند کے دورے کے بارے میں بات کروں گا۔ کابل کی بات کا وعدہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن سلسلہ جنبانی کرچکا ہوں۔ ضرورت دوبارہ زنجیر کھٹکھٹانے کی ہے۔

آپ کا خط آتا ہے تو بڑی مسرت خوشی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے خطوط کے صندوق میں ایک "گوشۂ آزاد" الگ بنا رکھا ہے۔

نیازمند
راج بہادر گوڑ

بنام : پروفیسر گیان چند جین

حیدرآباد

۱۰ مارچ ۱۹۸۳ء

محترمی ڈاکٹر گیان چند صاحب
تسلیمات

میری طرف سے ساہتیہ اکاڈمی کے ایوارڈ پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ ایک عرصے کے بعد ساہتیہ اکاڈمی کو اردو کا خیال ہوا ہے۔

میں آپ سے مل کر مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ اور پھر تہنیتی جلسے میں بھی شرکت سے اپنی غیرادبی مشغولیتوں کی وجہ سے محروم رہا۔

ویسے اودھیش سے کہا تھا کہ آپ تک میرا پیام تہنیت پہنچا دے لیکن اس سے تشفی ممکن نہ تھی۔

کل ہی بمبئی سے حیدرآباد آیا۔

امید کہ آپ میری طرف سے تاخیر کو اپنی روایتی فراخدلی سے معاف فرمائیں گے اور میری ناچیز مبارکباد قبول فرمائنگے

راج بہادر گوڑ

بنام : ڈاکٹر خلیق انجم

(۱)

۳۰ جولائی ۱۹۷۶ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

تسلیم و نیاز

آپ کے جواب کا انتظار ہی ہے۔ آخر میرے تبصرے کا کیا حشر ہوا؟ کچھ نہیں تو واپس ہی کر دیجیے۔ ویسے اس میں کیا قباحت کی بات آگئی ہے نہ تو آپ نے بتایا اور نہ میری سمجھ میں کچھ آرہا ہے۔

ادھر "روشنائی" کا مقدمہ لکھنے کی تیاری میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب میں نے دوبارہ پڑھی۔ ترقی پسند ادب پر۔ اب جب انجمن نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا طے کیا ہے میری رائے میں خلیل الرحمٰن صاحب سے درخواست بھی کرنی چاہیے کہ وہ اس میں ضروری تبدیلی کرنا چاہیں تو کر دیں۔ تبدیلی ضروری ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں بہت سی باتیں بڑھائی ہوں گی۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۹۵۷ء میں لکھی تھی۔ آخری بات ۱۹۷۱ء میں اور کتاب چھپی ۱۹۷۲ء میں۔ ۱۹۵۷ء میں جب وہ لکھ رہے تھے ان کے سامنے حیدرآباد اردو کانفرنس میں بنے بھائی کی تقریر تھی جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بجائے انجمن اردو مصنفین کی بات کی تھی۔ ان سے اس مسئلہ پر ترقی ادیب متفق نہیں تھے اس وقت بھی۔ اور یہ بات خلیل الرحمٰن صاحب کے سامنے نہیں تھی۔ اردو زبان جس دور سے گزر رہی تھی اس کے لیے انجمن ترقی اردو تھی ہی۔ اردو مصنفین الگ سے کیا تنظیم بناتے؟ سویت یونین میں صرف انجمن سویت مصنفین ہے۔ سو تو ٹھیک ہے۔ سویت سماج میں طبقاتی آویزش نہیں ہے

ایک دوسرے سے متصادم اور متحارب طبقات نہیں۔ اس لیے ادب کے سامنے وہ مسائل نہیں ہیں جو ایک طبقاتی سماج کی ناآسودگیاں پیدا کرتی ہیں۔

اس بحث کے بعد انجمن کا احیا عمل میں آیا اور کرشن چندر معتمد عمومی تھے۔ پھر دلی کانفرنس ہوئی۔ اور اب تو باقاعدہ تنظیم قائم ہو گئی ہے۔ اب اسے فیڈریشن کی شکل دے دی گئی ہے۔ ہر زبان کی الگ تنظیم ہے جو ریاستی تنظیم ہوئی۔ اردو کی کل ہند تنظیم ہے جس کی کانفرنس حال ہی میں دہلی میں ہوئی تھی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب یقیناً تاریخی اعتبار سے ان حقیقتوں کا ذکر کرنا چاہیں گے تاکہ کتاب up to date ہو جائے۔ ورنہ کتاب ایک معنی میں out of date ہو کر رہ جائے گی ان کی اپنی رائے ہو سکتی ہے اور وہ اس پر قائم رہیں۔ "تحریکی ادب" سے ان کی بدظنی باقی رہتے ہوئے ادبی تحریکیں باقی رہیں گی۔ اور آج کی دنیا میں کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تنظیم بھی نہ ہو۔ یہ بغاوتوں کا نہیں انقلابات کا دور ہے۔ انقلاب کے پیچھے تنظیم ہوتی ہے، اس کے سامنے ممکن الحصول کا نقشہ ہوتا ہے، مستقبل کا ایک Blue Print ہوتا ہے۔ انقلاب گھونس کی طرح گھر نہیں کھود ڈالتا۔ یہ انارکسٹ آتا ہے۔ وہ معمار کی طرح کھودے گا، بنیاد ڈالے گا اور نئی عمارت بنائے گا جس کا وہ پہلے سے منصوبہ تیار کر چکا ہے

میں بہت دور نکل گیا۔ منشا صرف یہ ہے کہ خلیل صاحب کو نظر ثانی کا موقع دیا جائے۔ اضافہ کریں شاید۔ پھر اُن کی مرضی۔

بہرحال آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ یوں بھی خط و کتابت سے مل لینے کا آدھا مزہ تو آ ہی جاتا ہے۔

آپ کا

راج بہادر گوڑ

(۲)

۱۱ فروری ۷۷ء ۱۹

پیارے خلیق انجم

بچی کی شادی کے موقع پر آپ کا پیام موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔

البتہ 'روشنائی' کے مقدمہ کے سلسلے میں بڑی تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ میں نے نوٹس ایک ٹ بک میں رکھے تھے اور وہ نوٹ بک غائب ہے۔ تلاش کر رہا ہوں۔ پھر یہ پنا دُکی گھما ی الگ ہے۔ سوچ رہا ہوں کیا کروں؟ کیا کتاب بغیر مقدمہ کے ہی چھپ جائے؟

ختم مارچ تک بہر حال مصروف رہوں گا۔ لکھنا پڑھنا اپریل سے پہلے ممکن نہیں۔

آج صبح تو پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔ اردو کی ایک جید شخصیت سے ہم محروم ہو گئے صدر جمہوریہ کی ات واقعی ہمارے لیے غنیمت تھی۔ وہ میرے شخصی دوست تھے۔ حمیدہ سلطانہ کو ایک خط ھ رہا ہوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ رشید احمد صدیقی کی کوئی یادگار قائم کرنی چاہیے اور اب یہ نیا ظلم ہو گیا۔

آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہماری زبان یا اردو ادب کا کوئی شمارہ ان دونوں شخصیتوں کے لیے کالا جائے؟

اردو گھر میں کوئی ہال ان کے نام سے موسوم کیا جائے۔ کہیں ہم لوگ اردو کے محسنوں کو بھلا تو نہیں رہے ہیں؟ بابائے اردو کو جلا وطن کر دیا۔ قاضی عبدالغفار کو بھلا دیا رشید احمد صدیقی چل بسے اور ہم نے جی کھول کر آنسو بھی تو نہ بہائے۔

کچھ سوچنا ہوگا

آپ کا

راج بہادر گوڑ

(۳)

حیدر آباد

۲۶ر فروری ۷۸ء

ڈیر خلیق انجم

بانو طاہرہ سعید، ہندستانی نژاد ایرانی ہیں۔ اور حیدر آباد کے بریگیڈیر سعید کی اہلیہ ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں شعر کہتی ہیں۔ ان کا ایک اردو مجموعہ چھپ چکا ہے اور دوسرا زیر ترتیب ہے انگریزی میں بھی کچھ نظمیں چھپی ہیں۔

میں نے کچھ انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ بھیج رہا ہوں۔ چاہو تو "ہماری زبان" میں

شائع کردو ۔

تمہارا
راج بہادر گوڑ

(۴)

۲ ستمبر ۱۹۷۸ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم
تسلیم و نیاز

پاکستان سے مرزا ظفر الحسن کا خط آیا ہے۔ ہم نے ان کی غالب لائبریری کو کتابیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انھوں نے اس کی یاد دلائی ہے۔

اب چوں کہ فیض دہلی میں مل سکتے ہیں، ان کو اردو گھر مدعو کیا جائے اور کتابوں کا تحفہ دے دیا جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

میرے لیے حسب ذیل کتابیں فراہم کر دیجیے ۔

"نیا ادب نئے مسائل" از بشیر نواز

آنگن۔ از خدیجہ مستور (ناول)

ٹیڑھی لکیر۔ عصمت چغتائی "

معصومہ " " "

عجیب آدمی " " "

شب گزیدہ۔ از قاضی عبدالستار "

آگ۔ از عزیز احمد "

میں اوائلِ اکتوبر میں دہلی آؤں گا۔ حاصل کر لوں گا۔

ایک بات اور

سنا ہے 'روشنائی' کا کوئی اڈیشن سبط حسن کے مقدمہ کے ساتھ پاکستان میں بھی چھپا ہے اور شاید اس میں ایک اشاریہ بھی شامل ہے جس سے ان ناولوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ جن کا کتاب میں ذکر ہے۔ اور یہ نئی نسل کے پڑھنے والوں کے لیے ضروری ہے۔ وہ ان ادیبوں سے

واقف نہیں ہیں جن کا ذکر 'روشنائی' میں ہے۔ آپ اس کتاب کا ایک نسخہ حاصل کر کے اس اشاریہ کو ہمارے اڈیشن میں بھی شامل کرلیں تو اچھا ہوگا۔ سنا ہے کہ یہ کتاب رضیہ سجاد ظہیر کے پاس ہے اور آپ ان سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اور کیا لکھوں ؟

اردو کے تہذیبی اور آئینی موقف کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے اگست کے 'کمیونسٹ جائزہ' میں شایع ہوا ہے۔ اس کا آف پرنٹ آپ کو ذریعہ ڈاک بھیج چکا ہوں۔ اس کے متعلق آپ کی رائے چاہوں گا۔

امید کہ آپ معہ الخیر ہوں گے۔ اور اردو کی خیریت ---- !

نیازمند

راج بہادر گوڑ

(۵)

حیدرآباد

۱۵ر ستمبر ۱۹۷۸ء

محبی خلیق انجم

کل ہی آپ کو ایک شکایتی لہجہ میں خط لکھ چکا ہوں۔ اور آج آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔

سیلاب کی خبر ویسے ہی بہت پریشان کن تھی۔ دہلی ٹرنک پر خبر لیتا رہا۔ لیکن آپ کے خط سے پتہ چلا کہ آپ خود بھی سیلاب کی زد میں رہے ہیں۔ کاش میں اس دکھ میں آپ کا شریک ہوتا۔

فیض کا اردو گھر میں استقبال کیا اچھا کیا۔ کتابیں بھی دیں اور بھی اچھا کیا۔ جلسہ کی رویداد "ہماری زبان" میں شائع ہوئی ہے۔ اب تو لگتا ہے آپ تصویریں بھی چھاپنے کے موقف میں آگئے ہیں۔

بمبئی میں فیض کے ساتھ جاں نثار اختر کے لڑکے کے گھر ایک محفل میں شام گزارنے کا اتفاق ہوا۔ بیدی، سردار، مجروح، سلمیٰ، رامانند ساگر، زیدی بہنیں، دلیپ کمار، جیا بھادری کیسے

آتشیں پیغمبروں کا ساتھ" تھا۔

یہاں حیدرآباد میں بھی شیخ سے کافی نیاز رہا۔ میرے گھر پر بھی ایک تناول طعام کی حقیر محفل تھی۔ لیکن غیر اسلامی مشروبات کا بھی دور تھا۔ آپ اس نعمت سے محروم ہیں حالاں کہ ایک غیر مسلم کو مار رکھا ہے۔

روشنائی کب تک شایع ہو رہی ہے ؟

میں ۲۴ ستمبر کو دہلی پہنچ رہا ہوں۔ انشاءاللہ ملاقات ہوگی۔ ۵ اکتوبر تک تو رہنا ہی ہے۔

باقی خیریت۔ انجمن کے سب کارکنوں کو اور سلام

آپ کا اپنا

راج بہادر گوڑ

(۶)

حیدرآباد

۲۵ جنوری ۱۹۸۰ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

آپ کا خط مورخہ ۱۸ جنوری کو ملا اور آج 'ہماری زبان' کی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس کی روئیداد بھی ملی۔ اس سے قبل انجمن کے قواعد کا مسودہ بھی مل گیا تھا۔

"سہیل" پر مضمون تو لکھ سکتا ہوں لیکن محض دوستانہ روابط اور تاثرات ہی ہوں گے۔ ان کے فن پر مضمون لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تو ان کی محض چند کہانیاں برسوں پہلے پڑھی تھیں۔ پھر کسی رسالہ کے (غالباً شاہراہ) ناولٹ نمبر میں ان کا ناولٹ "بے جڑ کے پودے" پڑھا تھا۔ اس کے بعد ان کی کتاب "مین چہرے" پڑھی تھی اور اس پر تبصرہ بھی کیا تھا۔ جو شاید 'ہماری زبان' میں شایع ہو چکا ہے۔ اپنی کم مایگی پر نادم اور آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

'ہماری زبان' کی مشاورتی کمیٹی کو میں حسب ذیل مشورے دینا چاہتا ہوں۔ وہ غور کرے۔

(۱) معیاری کلام ضرور شایع ہو لیکن نوجوان شاعروں کی ہمت افزائی بھی ضروری ہے۔ البتہ ان دونوں مقصدوں میں توازن کا خیال رہے۔

(۲) اردو کے تعلیمی اور اشاعتی اداروں کی خبریں شایع ہونی چاہییے۔ اس غرض سے انجمن کی

ریاستی شاخوں کو توجہ دلائی جائے اور پھر انجمن کے عام اراکین اس تعلق سے نامہ نگار کے فرائض انجام دیں۔

(۴) مشاورتی کمیٹی کے ناموں کے چھاپنے کے فیصلے پر عمل آوری اور صرف پرانی مجلس مشاورت کے نام شایع کرنے کے خلاف احتجاج۔

میں پھر عرض کروں، میں اس بات پر بضد ہوں کہ انجمن کے فیصلوں کو مسخ نہ کیا جانا چاہیے۔

آپ کا

راج بہادر گوڑ

(۷)

۲۴ جون ۱۹۸۰ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

تسلیمات

آپ کا نوازش نامہ آج ہی ملا۔

کتاب بلکہ کتابیں آپ نے پروفیسر ممتاز حسین کو بھیج دی ہیں اس کا شکریہ۔

'حیات جاوید' پر تبصرہ اتنی جلدی نہیں۔ البتہ جولائی کے تیسرے، چوتھے ہفتے تک بھیج دوں گا۔

"ہماری زبان" کی ۸ جون کی اشاعت میں صفحہ پر کچھ نایاب کتابیں' کے عنوان سے جو فہرست ہے ان میں سے مجھے حسب ذیل کتابوں کی ضرورت ہے۔

مصیبتیں	(افسانوں کا مجموعہ)	بھارت چند کھنہ	-/۵
نئے پرانے	(" ")	سہیل عظیم آبادی	-/۵
خفیہ	(روسی ادیبوں کے افسانوں کا ترجمہ)	عشرت بخاری	-/۵
دھوپ چھاؤں	(نظموں کا مجموعہ)	فضل الرحمٰن	-/۵
مشاہیر چین		میر عابد علی خاں	-/۵
لینن گراڈ تا سمرقند		عشرت علی صدیقی	-/۵

میں ۲۶ جولائی کو دہلی آرہا ہوں۔ کتابیں حاصل کرلوں گا۔

نیازمند
راج بہادر گوڑ

(۸)

حیدرآباد
۲ فروری ۱۹۸۳ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم
تسلیمات

انجمن کی مجلس عام کا دعوت نامہ ملا۔ ادھر میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ خون میں شکر بڑھ گئی تھی۔ دواخانہ میں شریک ہوگیا تھا۔ اب نسبتاً آرام ہے۔

آج آنکھوں کا امتحان بھی کروایا ہے۔ غالباً عینک بدلنی ہوگی۔

آواز میں بھی مستقل خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے کہ جلسوں میں تقریر نہ کروں اور ویسے بھی بلند آواز سے بات نہ کروں۔

پھر بھی میں مجلس عام کے اجلاس میں شرکت ضرور کروں گا۔ اور ممکن ہوا تو ۱۱ فروری کی دوپہر تک ہی دہلی پہنچ جاؤں گا۔

اس جلسہ عام میں بجٹ کی پیش کش بھی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ پھر تو مجلس عام کا اجلاس طلب نہیں کر پائیں گے۔

اور سب احباب کو سلام

آپ کا اپنا
راج بہادر گوڑ

(۹)

۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) ریاست کرناٹک کی ضلع واری شاخوں کی تفصیل اور ان کے عہدہ داروں

کے نام اور پتے منسلک ہیں۔

میں نے ان کے کام کی تفصیل مانگی تھی۔ سو تو وہ کچھ دنوں میں بھیج دیں گے۔ وہ وقت چاہتے تھے۔

انھوں نے حال ہی میں ایک کامیابی حاصل کی ہے۔ سرکار نے انتخابی مقابلوں میں کنڑی میں انٹرویو کی شرط لگائی تھی۔ اردو طلبا کے لیے یہ رعایت حاصل کر لی گئی ہے کہ سرکاری ملازمت کے لیے انٹرویو کے وقت ان سے کنڑی کا انٹرویو نہیں لیا جائے گا۔ لیکن ایک سال میں وہ زبان سیکھ لیں۔ اگر پھر بھی وہ نہ سیکھ پائیں تو انھیں انگریمنٹ نہیں ملے گا۔ لیکن ملازمت سے علیحدہ نہیں کیے جائیں گے۔

ان کے کچھ مطالبات بھی ہیں:

۱. وہ چاہتے ہیں کہ مولوی محمد علی صاحب کے انتقال کے بعد ان کا کوئی نمایندہ مرکز میں نہیں ہے۔ نامزدگی کی کوئی جگہ خالی ہو تو اس بار ان کو ترجیح دی جائے۔

۲. نگراں کمیٹی کی ایک رپورٹ چاہیے۔

۳. ان مختلف ریاستی اور مرکزی سرکاروں کے حکم ناموں کی نقل چاہیے۔ جن کی رو سے انجمن کو گرانٹ ملتی ہے۔ تاکہ وہ اس بنیاد پر اپنی سرکار سے بھی گرانٹ حاصل کریں۔

۴. وہ ایک ماہنامہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ "ہماری زبان" ہی کا ایک ماہانہ اڈیشن بنگلور سے نکالا جائے۔ میں نے کہا شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔ تب انھوں نے کہا کہ مرکز ہی کوئی موزوں نام تجویز کر کے انھیں مطلع کرے۔ انھوں نے کچھ نام بھیجے تھے۔ لیکن رجسٹرار نے سبھی نامنظور کر دیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کی مدد کریں۔

نیازمند

راج بہادر گوڑ

۱۴ اپریل ۱۹۸۶ء

حضور، تسلیم

آپ کا حکم اور میں ٹالنے کی ہمت کروں! آخرت میں کیا جواب دوں گا؟ آپ سربلند کھڑے ہوں گے اور میں سر بسجود گنہگاروں کی صف میں ہوں گا۔ یہ مجھے منظور نہیں اور نہ اس کا الٹ ہی منظور ہے۔ تار بھی کر دیا ہے، ملا ہوگا۔

میں ۲۵ اپریل کی صبح دہلی پہنچ رہا ہوں۔ شام میں عاملہ اور مجلس عام میں شریک ہوں گا ۲۶ کے سمینار میں آپ کے حکم کے مطابق مقالہ پڑھ دوں گا۔ آپ نے اپنے پہلے خط میں جو نوٹس کی حیثیت رکھتا تھا، دونوں سمینار ۲۶ اپریل ہی کو رکھے تھے اور اب لکھا ہے کہ ایک ۲۶ کو اور دوسرا ۲۷ کو ہوگا۔

۲۷ اپریل کو ۳½ بجے ایوان غالب میں دہلی کی انجمن ترقی اردو کا اجلاس ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے شدت سے اصرار کیا ہے کہ میں وہاں حاضری دوں۔ اب انھیں ناراض کرنا کس کے بس میں ہے؟ میرے بس میں تو نہیں قدیم کرم فرما ہیں۔ اور لگتا تو یہ ہے کہ تہذیب مغلیہ کی باقیاتِ صالحہ میں ان کا شمار ہوگا۔ یقین نہ آتا ہے تو ثروت آرا بیگم ہی پڑھ لیجیے۔

اچھا تو خدا حافظ، شمیم کو پیار، سب احباب اردو گھر کو محبتیں
اور آپ کو "دشنام یار"

راج بہادر گوڑ

(۱۱)

حیدر آباد

۱۱ جنوری ۱۹۸۷ء

پیارے خلیق انجم

"گجراتی زبان و ادب اور پنا لال پٹیل" مضمون حبیب صاحب کو دے آیا تھا۔ پنا لال پٹیل کی تصویر بھیج رہا ہوں۔ مضمون پسند آئے تو چھاپ دینا۔ اس ادیب کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے۔ اردو کے قارئین گجراتی سے ناواقف ہیں اس لیے گجراتی زبان و ادب کا مختصر پس منظر دیا ہے۔

تب اردو گھر آیا تھا لیکن تم اسی وقت ـــ جا چکے تھے ۔

موہنی کا کیا حال ہے؟ میرا پیار کہنا

تمہارا اپنا

راج بہادر گوڑ

(۱۲)

۱۹ اپریل ۱۹۸۷ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

آپ کا بھیجا ہوا رجسٹرڈ پوسٹ ملا جس میں Seminar کا اردو نمبر، آپ کا خط اور چیک بھی کچھ تھے ۔

سیمنار کے مضامین تو خیر جیسے کچھ ہیں لیکن آخر میں چھپی ہوئی Bibliography اہم ہے ۔ انگریزی میں کہاں اردو کے متعلق کیا مل سکتا ہے سبھی کچھ ہے ۔ مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اردو کے متعلق کیا کیا کچھ انگریزی میں لکھا ہے ۔

کل ہی صبح میرے بڑے لڑکے کی بیوی کا آپریشن کروانا پڑا ۔ اسے پیشاب میں رکاوٹ کی شکایت تھی، لیکن امتحان سے پتہ چلا کہ رحم میں ایک بڑا Fibroid (Sem/5.5.Cm) ہے جس کی وجہ سے مثانہ پر وزن پڑ رہا تھا اور پیشاب کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی ۔

آپریشن بخیر وخوبی ہو گیا ۔ ایک ہفتے میں گھر آ جائے گی ۔ میں آج کل کچھ اسی چکر میں ہوں ۔ پھر بھی ۲۳ اپریل کی صبح کلکتہ چلا جاؤں گا ۔ اور وہاں سے ۲۸ یا ۲۹ اپریل کو کچھ دنوں کے لیے دہلی آؤں گا ۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی ۔

خیر اندیش آپ کا

راج بہادر گوڑ

URDUADAB

QUARTERLY

EDITOR
Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI